

غالب اور غالبیات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ستارہ امتیاز)



غالب اور غالبیات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
(ستارہ امتیاز)

بیکن بُکس



• کوئی مارکیٹ یا روڈ بازار، لاہور فون 7351662 - 042

• ٹکسٹ، ملتان فون 8520791, 8520790 - 061

BEACON
BOOKS

E-mail: beaconbookspakistan@hotmail.com

E-mail: beacon_books_pakistan@yahoo.com

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ نہ کین بکس / مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت
 لئے بغیر کین بھی شائع نہ کیا جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال
 پیدا ہوتی ہے تو پبلشر / مصنف کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہوگا۔

اشاعت : 2005ء

عبدالجبار نے
 لعل شاعر پر تنقید پر ایس سے
 چھپوا کر کین بکس ملتان - لاہور
 سے شائع کی۔

قیمت : 125/- روپے

ISBN 969 - 534 - 058 - X

انتساب

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اُردو کے
اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے نام جن کی محبت
ارزائیاں مجھے بشاش و توانا رکھتی ہیں اور جن کی علمی و
ادبی سرگرمیاں، ہم عصر جامعات کے لئے قابلِ
رشک بن گئی ہیں۔

فرمان فتح پوری

فہرست مضامین

- ۱۔ کتاب سے پہلے (دعا)
- ۲۔ غالب سے متعلق ادوارنی شذرات:
 - ☆ وگروائے راز آید کناہ
 - ☆ دیوان غالب سے بھی قال نکال سکتے ہیں
 - ☆ غالب کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم
 - ☆ سوویت یونین میں غالب کی مقبولیت
 - ☆ غالب کی فارسی شاعری اور سید حامد
 - ☆ غالب اور تصوف
 - ☆ کچھ غالب کے بارے میں
 - ☆ بحوالہ غالبیات
- ۳۔ غالب سے متعلق کتابوں پر تبصرے:
 - ☆ احوال و تنقید غالب
 - ☆ روح المطالب فی شرح دیوان غالب
 - ☆ تذکرہ غالب
 - ☆ فلسفہ کلام غالب
 - ☆ غالب ڈائری
 - ☆ غالب اور مطالعہ غالب
 - ☆ جنگدہ ال آشب
 - ☆ صحیفہ سہ ماہی غالب نمبر
 - ☆ محاسن کلام غالب
 - ☆ غالب کون؟
 - ☆ "نقوش" غالب نمبر
 - ☆ "ادب الحقیق" غالب نمبر
 - ☆ دیوان غالب نئے حمید

- ☆ غالب اور انقلاب متبادل
☆ حیات غالب کا ایک باب
☆ اشارے غالب

۴۔ غالب سے متعلق دو مصنفین کا تعارف:

- ☆ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی
☆ دیوان غالب نسخہ خولید اور ڈاکٹر سید معین الرحمن
☆ سخنے جواد غالب
☆ دام آگہی: مغرب میں غالب شناسی کی تازہ مثال
☆ غالب سے متعلق اپنی کتابوں کے دیباچے:

- ☆ غالب: شاعر امر و زہد فردا
☆ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب
☆ شرح دشمن فریاد غالب
☆ تعبیرات غالب
☆ غالب سے متعلق مضامین جو میری کسی کتاب میں شامل نہیں:

- ☆ غالب اور محاسن کلام غالب
☆ آسی کی شرح دیوان غالب
☆ نقش ہائے رنگ رنگ
☆ غالب کی اردو زبانیں
☆ غالب اور ڈاکٹر ایس کے نیازی

۵۔ غالب سے متعلق میری اپنی تحریریں پر چند ناقدین کے تاثرات:

- ☆ غالب شاعر امر و زہد فردا سید وقار عظیم
☆ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناس ڈاکٹر سید معین الرحمن
☆ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی کے چند پہلو ڈاکٹر اسلم ہمدانی
☆ سلسلہ غالب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے غیر مرتب مقالات و تعارفات سید انصاف
☆ غالبیات فرمان فتح پوری کا اشاریہ عاصمہ وقار

کتاب سے پہلے

اُردو شعرا میں غالب میرا محبوب ترین "شاعر" ہے۔ مطالعہ غالب کا شوق ساتویں آٹھویں جماعت سے اوائل عمری میں پیدا ہوا، روز بروز بڑھتا گیا، غالب اور کلام غالب کے بارے میں سوچنے اور لکھنے پڑھنے کا وسیلہ بنا، اذلیں تحقیقی و تنقیدی مضامین کا عنوان بھی غالب ہی رہے اور سب سے زیادہ میں نے جس شاعر کے بارے میں لکھا یا جس شاعر نے اپنے بارے میں مجھ سے سب سے زیادہ لکھوایا وہ بھی اسد اللہ خان غالب تھے چنانچہ بھلا اللہ، اُن کے بارے میں اب تک میری متعدد ذیل پا، کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) "غالب: شاعر امر و زلفروا" مطبوعہ اعجاز سنز، لاہور ۱۹۷۷ء، طبع اول

(۲) "گمنام کا دوسرا قدم اور غالب" مطبوعہ حلقہ نیاز و نگار، کراچی ۱۹۹۵ء، طبع اول

(۳) "شرح و متن غزلیات غالب" مطبوعہ یکن بکس گل گشت یون روڈ ملتان ۲۰۰۰ء، طبع اول

(۴) "تعبیرات غالب" مطبوعہ ادارہ نیا دگار غالب، کراچی ۲۰۰۲ء، طبع اول

ان کتابوں نے مجھے غالب کے رشتے سے، زبان و ادب کے قارئین سے متعارف کرایا، تو غیر بخشی، تحقیق و تنقید کے باب میں سرخرو کیا اور لکھنے پڑھنے پر اس طرح مستعد و آمادہ رکھا کہ غالب کے ساتھ ساتھ میں نے موضوعات و اصناف کے حوالے سے تقریباً زبان و ادب کی جملہ اہم شاخوں کو اپنے مطالعے کا محور بنا لیا۔ اُردو زبان، اُردو مشنویات، اُردو کی منظوم داستانیں، اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری اور اُردو افسانہ غرضیکہ سب پر اپنی بساطِ بحر تحقیقی و تنقیدی کام کیا اور ان کے موضوعات و مسائل پر اُردو کو پوری پوری کتابیں دے دیں لیکن ان موضوعات سے لگاؤ یا غالب کا مسلسل مطالعہ، نہ تو میرے ذوقِ تحقیق و تنقید کو یک رُخ کر اسکا اور نہ مجھ سے اُردو کے دوسرے بڑے شعرا کو جی بھر پڑھنے اور اُن پر سوچنے اور لکھنے کا حق چھین سکا، چنانچہ مجھے یہ محسوس کر کے طمانیت ہوتی ہے کہ میں نے صرف غالب کے بارے میں نہیں بلکہ میر تقی میر، میر جگر علی انیس اور علامہ اقبال جیسے بڑے شاعروں کے بارے میں بھی اپنے مطالعات کو جامع صورت میں پیش

رنے کی سعی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں

۱۔ اقبال سب کے لئے

۲۔ میر انیس حیات اور شاعری

۳۔ میر تقی میر کو سمجھنے کے لئے

کے عنوانات سے میری حقیقی تہذیبی کتابیں منظر عام پر آئیں اور اسی مقبول موسم کے ان کے کئی نئی ایڈیشن شائع ہوئے لیکن یہ سب پھر دیکھنے کے بعد بھی ذوق غالب نے میر کی یہ پہچان کرنا نہ کر سکی اس سے اپنا دلچسپ اتحاد کا پتہ نہ چلا۔ وقت آپ سے باتوں میں جو کتاب ہے، وہ غالب کے لئے میں میری دلچسپی کتاب ہے۔ اس کا عنوان ہے ”غالب اور غالبیات“

اس کتاب میں نیا ہے اس کا اندازہ قارئین کو فہرست مضامین سے ہو جائے گا، البتہ اس سوال کا جواب کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ کیسا ہے، مجھے نہیں آپ کو دینا ہے۔ میر کی اس ضروری کا تو آپ میں سے بیشتر کو کم ہے کہ اردو شعرا میں مجھے غالب سب سے زیادہ عزیز ہے اور اس کے فکر و فن کے بارے میں میری رائے مختصر شروع سے یہی رہی ہے کہ

بلانے ہاں ہے غالب اس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

یہ میں ”غالب اور غالبیات“ کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہتا ہے کہ اس کتاب کی حیثیت، ”غالب کی دلربائی و روحانی سے تعلق سے اردو کی دنیوی کھوجن جیسی ہے اور جو لوگ اس کھوجن کی صلاح و فائدہ کے لحاظ آشتیا ہیں، وہ اس کی دھندلہ رو رہیں گے۔

آخر میں مجھے شہرہ یا ادھر ہے شعبہ اردو کے استاد جناب محمد ساجد خان صاحب کا اور تنہا کہیں کے جناب عبدالجبار صاحب کا۔ جن کے لطف خاص سے یہ کتاب اتنی جلد منظر عام پر آئی۔ کتاب کے نام کا جواز آپ کو کتاب کے مطالعے سے خود بخود مل جائے گا کہ اس میں صرف غالب و کلام غالب ہی نہیں بلکہ ان سے متعلق تصانیف و مصنفین بھی زیر بحث آئے ہیں۔

غالب کے بارے میں اداری شذرات

وگردانائے راز آید کہ ناید

ابھی غالب کی صد سالہ بری کی تقریبات کا سلسلہ ختم بھی نہ سونے پایا تھا کہ اقبال کی بری کی تقریریں شروع ہو گئیں۔ مانا کہ یہ امر اتفاقی ہے لیکن ان دونوں میں ایک معنوی رشتہ بھی ہے۔ اس رشتے کے سبب اردو میں جب کبھی عظیم شاعری کے سلسلے میں غالب کا ذکر کیا جائے گا اقبال بہر طور زیر بحث آئیں گے اور جب اقبال کی عکسما نہ شاعری کا تذکرہ ہو گا تو غالب خود بخود ذہن میں آجھڑ آئیں گے۔ بات یہ ہے کہ عہد و ماحول کے اختلاف کے باوجود غالب اور اقبال ایک دوسرے سے بہت گہری باطنی مناسبت رکھتے ہیں، ان کے فکرو فن میں عجیب و غریب قسم کی معنوی مماثلت ہے۔ صرف یہی نہیں کہ دونوں، اردو، فارسی کے خلاق و عظیم اور مفلح و صاحب طرز شاعر ہیں بلکہ زندگی و کائنات اور فکرو فن کے بارے میں ان کے خیالات و نظریات باہم اسنے ملتے جلتے ہیں کہ بعد زمانی کے باوجود وہ ایک دوسرے سے بہت قریب نظر آتے ہیں، چند اشعار دیکھیے:

غالب

حسن فروغ شمع خن دور ہے اسد
پہلے دل کداخت پیدا کرے کوئی

اقبال

تھیں ہیں سب ناقص خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سوائے خام خونِ جگر کے بغیر

عالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
مفتی نہیں ہے ہادہ و ساغر کے بغیر

اقبال:

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست
صحتِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

عالب:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے نکال نہیں اب تک
رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے

اقبال:

بارغِ بہشت سے مجھے حکم سزا دیا تھا کہیں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

عالب:

ہم نوحہ ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
تمہیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اقبال:

بھان رنکب و خوں کو تو ذکرِ ملت میں غم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی، نہ تورانی نہ افغانی

عالب:

نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اقبال:

چمن زاہرِ محبت میں شوخیِ موت ہے بیکمل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فلکاں تک ہے

غالب:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش کے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اقبال:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے استحسان اور بھی ہیں

غالب:

لازم نہیں کہ خطر کی ہم چوڑی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اقبال:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود نشی
رستہ بھی ذمہ خطر کا سودا بھی چھوڑ دے

غالب:

طاقت میں تار ہے نہ مئے و انگلیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اقبال:

سودا گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی قرنا بھی چھوڑ دے

غالب:

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

اقبال:

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہا تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے نریاں تک ہے

غالب:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہوں
خوش نظر ہے آئینہ دائمِ نقاب میں

اقبال:

یہ کائنات ابھی ناقص ہے شاید
کہ آری ہے مدامِ صدائے کلن فیکون

غالب:

خوش بود فارغ ز بید کفر و ایمان زبستن
حیف کافر مردان و آوارِ مسلمان زبستن

اقبال:

ظلم ہے خبری، کافری و دینداری
صفتِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ

غالب:

قطرہ میں دریا دکھائی دے اور جزر میں ٹھل
تھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بیٹا نہ ہوا

اقبال:

جہتو ٹھل کی لئے بھرتی ہے اجڑا میں مجھے
درو بے پایاں ہے درو لا دوا رکھتا ہوں

غالب:

جلوہ و نظارہ چندی کہ از یک گوہر است
خولیش را در پردہ خلقی تماشا کردہ

اقبال:

صورتِ گر کہ چکرِ روز و شب آفرید
از نقشِ این و آن بہ تماشا ئے خود رسید

عالب:

لغات بے کثافت جلوہ عیا کر نہیں سکتی
 چمن رنگار ہے آئینہ دار بہاری کا

اقبال:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
 چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولسوی

عالب:

رہنم ہستی ہے عشق خانہ ویاں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے گر برقِ خمیں میں نہیں

اقبال:

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
 ہند ہیں بزمِ غموشاں چچ غوغائے عداوت

عالب:

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
 ہے گریباں تک جہانن جو رامن میں نہیں

اقبال:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تھا کچھ نہیں
 موج ہے دیا میں اور ہیر دلہا دیا کچھ نہیں

عالب:

یعنی پہ صپ گردشِ بچانہ صفات
 عارف ہمیشہ سب کے ذات چاہئے

اقبال:

برمقام خود رسیدن زندگی است
 ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

غالب:

بخت نہ کند چارہ سرو کی ما
تغیر بہ اندازہ ویرانی مانمست

اقبال:

دل عاشقان پہ بھرو بہ ہر شے جاودا نے
نہ نوائے درد مندوں نہ خمے نہ غم گسارے

غالب:

کارے عجب افتاد بایں شیفتہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نہ توں گفت

اقبال:

اکھل غزل خواں را کافر نہ توں گفتن
سودا بہ دماغش زو اثر مدرسہ بیروں بہ

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں اشعار ہیں جن میں غالب اور اقبال کے گھروں کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔ غالب کے بعد ایک دو نہیں اردو میں متحدہ ایسے شاعر سامنے ہیں جن کی بڑائی مسلم ہے۔ حالی، حسرت، غالبی، اصغر، جوش، فراق، یگانہ، عزیز و آثر اور شاد و جلال سب قابل احترام ہیں لیکن اردو کے جن شاعروں نے گھروں کی بلند ترین و عظیم ترین چوٹیوں کو چھو لیا ہے اور جن کا نام دنیا کے چند گئے چنے مشاہیر فن کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ ان میں غالب کے بعد صرف اقبال کا نام آتا ہے۔ اقبال کی شاعری صاف ظاہر کرتی ہے کہ انھوں نے غالب کے اس چیلنج کا جواب بن جانے کی کوشش کی ہے

کون ہوتا ہے حریف مئے مردانگین عشق
ہے مکر لب ساقی میں صلا، میرے بعد

لیکن آج کل کے ہاشیے اور پست ذہن ادیبوں یا شاعروں کی طرح اقبال اپنے بزرگوں کی رہنمائی کے بغیر نہیں ہیں بلکہ ان کا رد کیا ہے جس روشنی کے ساتھ وہی ہے جو کسی خود کا اپنے بزرگ کے سامنے ہونا چاہیے۔ چنانچہ اقبال نے ایک دو جگہ نہیں کئی جگہ اجمال سے نہیں خاصی تفصیل سے، جگہ نظری سے نہیں بڑی فراغ دلی سے غالب کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس

اعتراف سے اقبال سبک سر نہیں ہوئے بلکہ ان کی عظمت اور بڑھتی ہے۔

یہ دراصل اردو کی خوش قسمتی تھی کہ جیسے ہی انیسویں صدی کے عظیم ترین شاعر کی آنکھ بند ہوئی، بیسویں صدی کا عظیم ترین شاعر اقبال پیدا ہو گیا۔ کاش بیسویں صدی کے آخر میں اکیسویں صدی کا عظیم شاعر نمودار ہو جائے اور اقبال کے آخری ایام کے ان اشعار:

سرود رفت باز آید کہ ناید

نہیے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارے این فقیرے

وگر دانائے راز آید کہ ناید

کا جواب بن کر علامہ اقبال کی روح کی تسکین کا ذریعہ بن جائے۔

دیوانِ غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں

چھپلے ڈیڑھ سو سال میں عیارِ اشعار اور عمدہ منتخبہ سے لے کر نگار کے ذریعہ نظرِ غالب نمبر، ملک مرزا نوشہ کے متعلق جس تفصیل و اہتمام سے لکھا گیا ہے، اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ پاک و ہند کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب، شاعر، نقاد یا مورخ ہو جس نے غالب کے بارے میں انکھار خیال نہ کیا ہو، لیکن ان کے متعلق جو شہرت و مقبولیت ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری کی رائے کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے نگار کی رائے کو نہیں نہ آئی، ڈاکٹر بجنوری کے لفظوں میں:

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وہ یہ مقدس اور دیوانِ غالب، لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، مگر سناؤ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ امواج جو نہیں۔۔۔“

اس رائے کو بعض ناقدین نے مبالغہ آرائی سے تعبیر کیا اور بعض نے ”سائراقی تنقید“ کہہ کر اس کی اہمیت کم کرنی چاہی لیکن ڈاکٹر بجنوری کی رائے غالب کے اس شعر کے مصداق۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چوں کہ ہمارے آپ کے دل کی آواز اور ہمارے ذوقِ حسین و تنقید کی تسکین کا ذریعہ تھی اس لئے بہت جلد زبانِ زحاکت ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی کے بعد، غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر بجنوری کے انھیں فخریوں نے جس ایک بار پھر چونکا یا ہے۔ ان کی بڑائی کا تازہ احساس دلایا ہے اور ان کے ادبِ شاعری کو پہچاننے اور پہچانوانے پر از سر نو آواز دیا ہے۔

ڈاکٹر بجنوری کے بعد سے اب تک غالب کے بارے میں کتنا کچھ لکھا گیا ہے، اس کی صحیح

مقدارِ غالب کے اشاریہ نگاری جتا سکتے ہیں لیکن اتنی بات تو ادب کا ہر جاری و ثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس عرصہ میں بلند پایہ تحقیق و تنقید کا کام جس انہماک، ذوق و شوق سے غالب پر ہوا ہے کسی اور شاعر پر نہیں ہوا اور آج غالب کے ”جشنِ صد سال“ کے موقع پر ان کے متعلق جو ٹیکروں تازہ کتابیں اور رسائل کے خصوصی شمارے شائع ہو رہے ہیں، یہ اسی انہماک و ذوق و شوق کا واضح ثبوت ہے۔

اس موقع پر بعض وجوہ سے میرا ارادہ نکار کے غالب نمبر نکالنے کا نہ تھا، اول اس لئے کہ غالب کی زندگی اور فن کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کے متعلق تازہ اور کارآمد مضامین کا فراہم کرنا آسان نہ تھا۔ دوسرے اس لئے کہ نگار اپنی اڑتالیس سالہ زندگی میں اس سے پہلے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۶۱ء میں مختلف نوعیت کے دو غالب نمبر پہلے ہی شائع کر چکا ہے اور آج جب کہ اکثر ادبی رسائل غالب نمبر شائع کر رہے ہیں۔ نگار کو اس انجود میں شامل ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے یہ خیال کیا کہ خود غالب سے اس بارے میں مشورہ کیوں نہ کر لیا جائے۔ لوگ عام طور پر کسی کام کے آغاز کے لئے حافظ کے دیوان سے قال نکالتے ہیں، میں یہ کام غالب کے اردو دیوان سے لیتا ہوں چنانچہ میں نے ان کا اردو دیوان کھولا اور آٹھ بند کر کے نقل رکھی یہ شعر سامنے آیا کہ۔

غالب خست کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئے زارِ دار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

گویا اس شعر کے ذریعے مجھے غالب نمبر نکالنے کی ممانعت کر دی گئی اور میں نے اس خیال ہی کو ترک کر دیا۔ کچھ دنوں بعد نگار کے قارئین اور قلمی معاونین کے خطوط آنے شروع ہوئے، کسی نے پوچھا:

”کیا نگار کا غالب نمبر شائع ہو رہا ہے؟“

اور کسی نے سوال کیا کہ:

”نگار کا غالب نمبر کب تک نکل رہا ہے؟“

میں نے ان سوالوں کے جواب میں خاموشی اختیار کی تو بعض حضرات نے یہ سوال اٹھایا کہ

”غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر نگار غالب نمبر کیوں شائع نہیں کر رہا۔“

سوال کرنے والے ایک دو نہیں بیکڑوں تھے، اس لئے میں بھی اس مسئلے پر از سر نو غور کرنے پر مجبور ہوا اور غالب کا دیوان دوبارہ اٹھایا۔ اب کے یہ شعر سامنے آیا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم چروہی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں، ہم سفر ملے

اس طرح ”غالب نمبر“ سے باز رہنے کی ایک بار پھر مجھے غالب کی طرف سے ہدایت مل گئی لیکن میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا ”آپ کی انہی پوری طرح اس شعر پر نہیں تھی بلکہ دو شعروں کے سچ میں تھی۔ اس لئے آپ آنکھ بند کیجئے اور دیوان کھول کر دوبارہ انہی رکھئے، میں نے یہ بھی کیا، اس بار انہی کے نیچے یہ شعر تھا۔

ہیں اہل خرد کس روشی خاص پہ تازاں

پا بستگی دم و رو عام بہت ہے

اس کے بعد ”غالب نمبر“ کا خیال ترک کر دینے کے سوا، میرے لئے کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اطمینان سے بیٹھ گیا، وقت گزرتا گیا، حتیٰ کہ دسمبر ۶۸ء شروع ہو گیا، جشن صد سالہ کی تاریخ بہت قریب آ گئی اور اب غالبیات کے مختلف اداروں اور انجمنوں نے یہ پوچھنا شروع کیا کہ:

”غالب کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”نگار نے کیا پروگرام بنایا ہے؟“

”کیا اس پروگرام کی تفصیل آپ ہمیں بھیج سکتے ہیں؟“

میں نے ان سوالوں کے جواب میں لکھا کہ نگار کے پاس اس سلسلے میں تو کوئی پروگرام ہے اور نہ وہ اس موقع پر کوئی چیز شائع کرے گا، اس کے جواب میں بعض اویہوں اور مخلص دوستوں نے مجھے اس طور پر سمجھانا شروع کیا کہ:

”ہندوستان میں ”غالب صدی“ سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ہر سطح پر خاصے دھوم

و دھام سے منائی جا رہی ہے۔ پاکستان میں الہند حکومت اس کام میں زیادہ دلچسپی

نہیں لے رہی، اس لئے نجی اداروں ہی کو اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے اور

کچھ نہیں تو اس موقع پر ہر ادبی رسالہ ایک ”غالب نمبر“ تو شائع ہی کر سکتا ہے

خصوصاً نگار کا اس سلسلے میں خاموش رہنا اس کی علمی و ادبی روایات کے متافی ہے،

نیاز صاحب ہوتے تو ضرور اس موقع پر کچھ کرتے۔“

آخری جملے نے میرے لئے تازیانہ کا کام کیا، میں چونک پڑا اور وقت کی گئی کے باوجود ایک بار پھر غالب نمبر کے سوچ میں پڑ گیا، دیوان غالب لایا، آنکھیں بند کیں اور دیوان کھول کر انگلی رکھی، یہ شعر سامنے تھا کہ۔

مہریاں ہو کے جالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا جنت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

گو یا بالکل آخری میں مجھے غالب نمبر کا لئے کاظم طابخت الجھن ہوئی، سوچنے لگا کہ ایک صبیحے میں یہ کام کیسے ہوگا، مضامین کہاں سے آئیں گے کب لکھے جائیں گے؟ اور پرچہ کب چھپے گا اور اگر کسی طرح چھپ بھی گیا تو اس میں خاص پتہ کیا ہوگی؟ اسی الجھن میں آنکھ بند کر کے غالب کے دیوان پر ایک بار پھر انگلی رکھی، شعر تھا۔

”بے رنگ لالہ دھل و نسریں جدا خدا

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

گو یا اس شعر کے ذریعہ مجھے غالب نے یہ سمجھا کر تسلی دی کہ نگار کا غالب نمبر جیسا کچھ بھی ہوگا، ”دوسرے پرچوں کے خصوصی شماروں سے الگ ہونے کے سبب قاری کی توجہ کا سبب بہر حال بنے گا، اس لئے اس خیال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن اصل سوال پھر بھی باقی رہا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مضامین اچھے یا بُرے لائے کہاں سے جائیں؟ اللہ کا نام لے کر ایک بار پھر دیوان غالب کھولا۔ اب کے اس شعر پر انگلی تھی۔

خفہ تا شکفتن ہا برگ عافیت معلوم

باوجود و بستی، خواب گل پریشان ہے

عجیب و غریب شعر سامنے آیا۔ مفہوم ہی آسانی سے سمجھ میں نہ آیا تبخیر کیا جنتی، بڑے غور و خوض کے بعد محسوس ہوا کہ جیسے ”دوسرے مصرعے کے پردے میں مجھے غالب یہ سمجھا رہے ہیں کہ:

”میرے پاس تو غالب نمبر کا بڑا قیمتی ساز و سامان موجود ہے تو اس سلسلے میں بے وجہ پریشان ہے۔۔۔“

میں نے اس ساز و سامان پر غور کرنا شروع کیا تو نگار کی اڑتالیس سالہ ادبی تاریخ اچانک میرے سامنے آ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ غالب کی زندگی اور فن کے متعلق سینکڑوں اعلیٰ درجے کے مضامین جو نگار کے اکثر قارئین کی نظر سے نوز پائیدہ ہیں، نگار کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں اور اگر

میں چاہوں تو ان کا انتخاب بڑی آسانی سے "غالب نمبر" کے نام سے پیش کر سکتا ہوں چنانچہ میں نے یہی کیا، سارے مضامین کو یکجا کرنا تو مناسب ہی نہ تھا، اول اس لئے کہ ایک مہینے کی قلیل مدت میں ان کی کتابت و طباعت ممکن نہ تھی۔ دوسرے اس لئے کہ نگار کے بہت سے مضامین بعض دوسرے رسائل مثلاً افکار کراچی کے "غالب نمبر" میں پہلے ہی شامل کئے جا چکے تھے، اس لئے اس مختصر عرصے میں جتنے مضامین آسانی سے نکھوائے جا سکتے تھے منتخب کر لئے۔ لیکن اس احتیاط و التزام کے ساتھ کہ غالب کی زندگی اور فن کے سارے اہم پہلو ایک مستند صحیفے کی صورت میں اس کے اندر صحت آئیں، معلوم نہیں یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی لیکن کم از کم اس سے یہ تو ہوا کہ مجھے جشن صد سالہ کے موقع پر روح غالب کے سامنے سرخرو ہونے اور قارئین نگار و پرستار ان غالب کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔

غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم

یہ شمارہ غالب کی یاد میں اور غالب کے خطوط سے متعلق ہے۔ ایک ایسے ادیب کے مرتبہ خطوط غالب سے متعلق ہے جسے غالبیات کے باب میں معتبر و مستند مقام حاصل ہے۔ میری مراد ڈاکٹر خلیق انجم سے ہے۔

غالب، اردو کے صرف عظیم شاعر ہی نہیں عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثر اگرچہ خطوط کی صورت میں ہے اور خطوط نگاری کی تاریخ میں ان کے خطوط منفرد مقام رکھتے ہیں۔ غالب کو اردو کی عام نثری تاریخ میں بھی بحیثیت صاحب طرز نثر نگار نہایت بلند و ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی نثر ہماری تہذیب، تاریخ، معاشرت، علمی و ادبی روایت اور ثقافتی تاوردو کاریوں کا آئینہ اور قلمی لطافتوں کے حامل معیار و اسلوب کا لازوال پیمانہ ہے۔۔۔ شاید اسی لئے ان کی نثر اردو کے سارے نامور محققوں اور نقادوں کے لئے جاذب نظر ٹھہری ہے اور ہر ایک نے بساط بھراس کی واوی ہے۔ غالب کے خطوط دو چار بار نہیں سیکڑوں بار مختلف اداروں سے شائع ہو چکے ہیں اور ایک دو نہیں درجنوں بڑے ادیبوں نے ان کی ترتیب و تدوین میں دلچسپی لی ہے۔ چنانچہ ان کے خطوط کے منتخبات و مراثات کے حوالے سے یوں تو متعدد نام لئے جاسکتے ہیں لیکن مرزا محمد مسکری، مولانا امتیاز علی مرثی، منشی مہیش پرشاد، آفاق حسین آفاق، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر خلیق انجم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم، ترقی اردو ہند کے سکریٹری جنرل ہیں اور متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ تحقیق و تنقید دونوں میں ان کے قلم نور ہے اعتبار حاصل ہے اور ان کی ہر تحریر اور کتاب، علمی و ادبی حلقوں میں انتہائی وقعت و قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا شمار اردو کے ان

ممتاز محققوں میں ہوتا ہے، جن کی ذہنی تربیت میں پروفیسر محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی خاں مرثی اور قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ اب تک ان کی پندرہ سولہ تصنیفات اور تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب ”مرزا محمد رفیع سودا“ شائع ہوئی تو پروفیسر آل احمد سرور نے اس علمی اور تحقیقی کارنامے کی داد دیتے ہوئے لکھا: ”جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس قابل قدر تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔“

خلیق انجم صاحب کو ابتدا ہی سے دو موضوعات سے خاص دلچسپی رہی ہے ایک غالبیات دوسرے ترمیم متن کے مسائل، غالب سے متعلق ان کی دو کتابیں ”غالب کی نادر تحریریں“ ۱۹۶۱ء میں اور ”غالب اور شاہانِ تیمور“ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئیں۔ ترمیم متن کے مسائل پر بھی اردو میں پہلی کتاب ”مقیہ“ انھیں کی توجہ سے منظر عام پر آئی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے برسوں کی محنت سے ”غالب کے اردو خطوط“ کا تحقیقی ایڈیشن تیار کیا ہے۔ یہ وہ کام ہے جس میں غالبیات اور مقیہ سے متعلق ان کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔

زیر نظر تنقیدی ایڈیشن میں غالب کے خطوط کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ خطوط غالب کے پہلے ایڈیشنوں اور غالب کے تقریباً پونے دو سو اصل خطوط یا ان کے ٹکسوں کو، بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہر خط کے متن کے تاخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اہم مجموعوں کے متن کے اختلافات تصحیح کئے گئے ہیں، غالب کے تقریباً پونے دو سو خطوط کے ٹکس شامل کئے گئے ہیں۔ مکتوب ابیم کے مختصر ساغ بھیجے گئے ہیں۔ بیشتر مکتوب ابیم کی تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں جن واقعات، افراد، مقامات، کتب اور رسائل وغیرہ کا ذکر کیا ہے، ان پر بڑی محنت، جستجو اور پیمائش سے تفصیلی حواشی بھیجے گئے ہیں۔ تمام خطوط کے مکمل اور جامع اشارے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ حواشی اور اشارے چوتھی جلد میں شامل ہیں۔ غالب انٹرنیٹ ٹیٹ دہلی نے چار جلدوں میں ساٹھ ٹکب انداز میں تیار کئے ہوئے غالب کے خطوط کے اس تنقیدی ایڈیشن کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر انجم کی مرتب خطوط غالب کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چوتھی زیرِ طبع ہے۔

ان جلدات میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:-

۱- مکتوب ابیم کی تصویریں۔

۲- مکتوب ابیم کے تفصیلی حالات۔

۳- ان تمام واقعات، افراء، مقامات، کتب اور رسائل پر جامع حواشی جن کا غالب نے اپنے خطوط میں ذکر کیا ہے۔

۴- ان تمام فارسی اور اردو اشعار کا اشاریہ، جنہیں غالب نے اپنے اردو خطوط میں نقل کیا ہے۔

۵- تمام افراء، مقامات اور کتب و رسائل کا مکمل اشاریہ۔

مطبوعہ تین جلدوں میں غالب کے خطوط، متن کے مآخذ اور حواشی کے ساتھ اختلافات نسخ بھی دیئے گئے ہیں۔

جلد اول کا تحقیقی و تنقیدی مقدمہ سواد و صفحات پر مشتمل ہے۔ گویا "خطوط غالب" پر ایک مکمل کتاب ہے۔ یہ مقدمہ کتنا گراں بہا ہے اور اپنے اندر کیا کچھ رکھتا ہے، اس کا صحیح اندازہ تو اس کے مطالعے کے بعد ہی ممکن ہے۔ البتہ اس جگہ جلد اول کے مقدمے کا صرف ایک جزو جس کا تعلق خطوط غالب کے مختلف ایڈیشن، املا کی خصوصیت اور بعض الفاظ کے استعمال سے ہے۔ نذر قارئین کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ خطوط غالب کی ترتیب و تدوین کا یہ کام، جسے ڈاکٹر خلیق انجم نے پانچ پانچ سو صفحات کی چار ضخیم جلدوں میں مکمل کیا ہے، کس نوعیت و معیار کا ہے اور غالب کو سمجھنے اور سمجھانے میں وہ کیا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

پوری اردو دنیا کی طرف سے ڈاکٹر خلیق انجم اور ان کے کام کے ناشر "غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب، دہلی" شکریہ اور خراج تحسین کے مستحق ہیں کہ ان کے ہاتھوں ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام پایا جو خطوط غالب کے سلسلے میں حرف آثر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(نگار فروری ۱۹۸۷ء)

سوویت یونین میں غالب کی مقبولیت

۱۹۶۹ء میں غالب کی ولادت کا شہنشاہی صد سالہ منایا گیا تو اس میں دنیا کے متعدد ملکوں نے حصہ لیا۔ کہیں مذاکروں کا اہتمام کیا گیا کہیں مشاعروں کا۔ کہیں تقریروں کے لیے بلند پایہ جلسے منعقد ہوئے اور کہیں تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل کتب و رسائل شائع کئے گئے۔

”سوویت چائزہ“ نامی رسالے نے بھی تیسری جلد کے دسویں شمارے یعنی فروری ۱۹۶۹ء کے پرچہ کو غالب کے لیے مخصوص کیا۔ یہ رسالہ شعبہ اطلاعات سفارت خانہ سوویت یونین دہلی سے شائع ہوا۔ اس شمارے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے سارے مقالات، ردی اور بیوں کے لکھے ہوئے ہیں اور غالب کی مقبولیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

رسالہ نگار چند کہ نایاب و کمیاب ہے اور اس کا نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے اس لیے تذکرہ نگار نہیں کیا جاتا ہے۔ یقین ہے کہ غالب شناسوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

(نگار، ستمبر ۱۹۸۶ء)

غالب کی فارسی شاعری اور سید حامد

جاننے والے جانتے ہیں کہ غالب کی فارسی شاعری، ان کی اردو شاعری سے کم تر درجے کی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان کی مقبولیت و شہرت کا ہر فارسی پر نہیں اردو پر ہے۔ یہی صورت کم و بیش علامہ اقبال کی ہے۔ میرے نزدیک اقبال کی فارسی شاعری بحیثیت مجموعی، اردو شاعری سے زیادہ توانا و پُر کار ہے۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ سو سال میں فارسی اور ذوق فارسی پر ایسا زوال آیا کہ غالب و اقبال کی فارسی شاعری کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فارسی زبان سے آشنائی اور فارسی ادب سے لطف اندوزی کے لیے شعوری طور پر کچھ نہ کچھ کیا جائے اور ایسے دل فہم اسلوب میں کیا جائے جو، ادب کے قاری کو فارسی زبان و ادب سے قریب تر لائے۔ میری مراد اس دلکش اسلوب سے ہے جس کی مثال میں، ہم مولانا شبلی کی ”شعرالجم“، مولانا آزاد کی ”آب حیات“، مولانا حالی کی ”یادگار غالب“، نیاز فتح پوری کی ”انتقادیات“، مسعود حسن رضوی کی ”ہماری شاعری“ اور مجنوں و فراق گورکھپوری کی تنقیدی تحریروں کو پیش کر سکتے ہیں۔

سائنسی، سماجی، نفسیاتی، سائنسیاتی، جین اعلویٰ اور بعض دوسرے نوع کی تنقید یقیناً بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تنقید کے ان دہستانوں نے اردو ادب کو فکر و نظر کا نہایت قابل قدر افق دیا ہے لیکن ادب پر فکر و فلسفہ اور علم و حکمت کا دباؤ کچھ اتار دیا گیا ہے کہ شعر و ادب کی ترویج و اشاعت تو دور کی بات ہے، اس کے بوجھ سے خود تنقید کی کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ پہلے کی بہ نسبت تعلیم عام ہونے کے باوجود ادب کے قارئین کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، اس فضا میں مجھے سید حامد صاحب

کا مقالہ ”غالب کی قاری غزل“ بہت کارآمد اور بھلا معلوم ہوا۔ انھوں نے اس کے ذریعے غالب کی غزل شاعری کو نہایت خوبصورتی سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ وقت خسرو، بیدل، فیضی اور غالب وغیرہ کے تقابلی مطالعے یا ان کے شاعرانہ مرتبے کے تعین کا نہیں بلکہ ان کی شناخت کروانے اور نئی نسل کو ان کی طرف راغب کرانے کا ہے۔ سید حامد صاحب نے اس فریضے کو جس خوبی سے اہام دیا ہے وہ میرے ذہن سے حدودِ جلائق متاثر ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کے آغاز میں بہت صحیح لکھا ہے کہ:

”مقصد غالب کی قاری غزل کا اردو غزل سے مقابلہ کرنا نہیں، غالب کی قاری غزلوں سے حظ اندوز ہونا اور اپنے حظ میں قارئین کو شریک کرنا ہے۔ شریک کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ فی زمانہ اردو جاننے والوں کی غالب اکثریت قاری نہیں جانتی اس لیے جو اشعار منتخب کیے گئے ہیں ان کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔“

غالب کی قاری شاعری کے سلسلے میں اس طرح کا صرف ایک مضمون اس سے پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ علامہ نیاز فتح پوری کا تھا۔ امداد امام اثر کی غالب ناشناسی کے جواب میں تھا اور یہ نگار میں چھپا تھا۔ نیاز کے اس مقالے نے غالب کی قاری شاعری کی طرف اہل ذوق کو رجوع کرنے میں وہی کردار ادا کیا تھا جو غالب کے اردو کلام کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری کے مقالے ”محاسن کلام غالب“ نے کیا تھا۔ بعد ازاں غالب کی قاری شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا۔ کتابی شکل میں بھی اور مقالات کی صورت میں بھی لیکن غیر دلکش حیرائے میں اس لیے بے اثر رہا۔ سید حامد صاحب کا مقالہ اس کی کوپورا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن حضرات کی نظر سے سید صاحب کا مقالہ گزرے گا وہ اس سے لطف اندوز بھی ہوں گے، غالب کی قاری غزل کا احساس بھی ان کے اندر جاگے گا اور ذوق قاری کو نکھارنے میں بھی انہیں اس سے مدد ملے گی۔

بہت دلوں سے سوچ رہا تھا کہ اس طرح کا کوئی تعدادی مضمون غالب اور بعض دوسروں کی قاری شاعری کے بارے میں لکھا جائے، اس سلسلے میں ممتاز غالب شناس اور غالب کے پرستار جناب آفتاب احمد خاں صاحب سے تبادلۂ خیال بھی ہوا لیکن عملاً کچھ نہ ہو سکا۔ سید حامد صاحب کا مقالہ سامنے آیا تو اسے پڑھ کر دلی مسرت ہوئی کہ کم از کم میرے لیے یہ ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“ کے مصداق ہے۔ یہ بات مزید خوشی کا باعث ہے کہ سید صاحب کے

مقالے میں غالب کی ساری اہم غزلیں اور بہترین اشعار زیر بحث آ گئے ہیں اور انھوں نے اسے خوبصورت نثر میں ان کی مختصر تشریح بھی کر دی ہے نیز ہم معنی اردو اشعار بھی چاہا جو اسے دیتے ہیں۔ البتہ غالب کے بعض نہایت دلکش و مشہور اشعار سید صاحب کے مقالے میں جگہ نہیں پاسکتے۔ اس کی وجہ غالب یہ ہوگی کہ ایسا کرنے سے مقالہ مزید طویل ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار میرے حافضے میں کلہاڑ ہے ہیں۔ اس لیے اگر میں ان میں سے چند اس جگہ درج کروں تو نامناسب نہ ہوگا۔

کارے عجب افتادہ بایں شیفتہ مارا کافر نہ بود غالب و مومن نہ تو اس گفت

دعز شناس کہ ہر نکتہ اوائے دارد محرم آست کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

جلوہ و نظارہ چہ داری کہ از یک گوہراست خویش را در پردہ خلتے تماشا کردہ

خوش بود فارغ ز بہ کفر و ایمان زیستن حیف کافر مرن و آؤغ مسلماں زیستن

شیوہ زندان ہے پروا خرام ازمن چہ رس ایں قدر دامن کہ دشوار است آساں زیستن

ٹھٹھ را نوا نرگست را تماشا تو داری بہارے کہ عالم نہ دارد

زمن حذر نہ غمی مگر لباس دیں دارم نہفت کافر و نہت در آستین دارم

جان غالب کتاب گفتارے کہاں داری جنوز سخت بیدردی کہ می چہی، زما، احوال ما

ہنوں مستم پہ فصل تو بہار اسی تو اس گلشن سراچی بر کف گل در کنار اسی تو اس گلشن

ہے تکلف در بلا و دن بہ از ہم بلاست قہر دریا سلجیل و روئے دریا آتش است

ہروں میا کہ ہم از منظر کنارہ بام نظارہ ز در نیم ہازی خواہم

آغہ ایم ہر سر خارے بخون دل قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

بوجہ خن کمرے و ایمانے کہا است خود خن در کفر و ایمان ی رود

ز کشت ی تپہ نعل رگ لعل گہر بارش شہید انتظار جلوہ غولیش است گفتارے

گر ذوق خن بہ دہر آئین بودے دیوان مرا، شہرت پردیں بودے

غالب اگر ایں فنی خن دیں بودے آن دین را ایز دی کتاب ایں بودے

گیرم بوقتہ ذبح سچیدن گناہ من داشتہ و شنہ میز نہ کردن گناہ کیست

یہ نو سید حامد صاحب کے مقالے کا تعارف تھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کی تازہ کتاب "غالب" مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم میں شامل ہے اور جس کا عنوان ہے "غالب کی قاری غزل"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود سید حامد صاحب کیا ہیں؟ میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس سوال کا قدرے تفصیل سے جواب دوں کہ میں سید صاحب کے کمالات سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہوں، قومی مسائل کے باب میں ان کی بصیرت کا قائل اور ان کے انداز فکر کا گماں ہوں لیکن انہوں نے نگار کے صفحات اس کی اجازت نہیں دے رہے۔ اس لیے مختصر اسی ان کے بارے میں کچھ عرض کر سکوں گا۔

سید حامد صاحب ۲۸ مارچ (۱۹۲۰ء) کو یوپی (اٹھارہ) کے ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول اور کالج کے امتحانات امتیازی نمبروں اور درجہ اولیٰ کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں

پاس کیے۔ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا پھر اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی سند لی۔ دونوں میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۳۳ء میں یو۔ پی کی صوبائی سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں خصوصی مقابلے کے امتحان اور سکلشن بورڈ سے کامیاب گزرنے کے بعد انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس سے متعلق ہو گئے۔ مختلف وفاقی وزارتوں کے سکریٹری اور متعدد سرکاری اداروں، کارپوریشنوں اور کمیشنوں کے چیرمین رہے۔ ہر جگہ اپنی قابلیت، محنت، دیانت اور خدا داد صلاحیت کی بدولت نیک نام اور کامیاب رہے۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیانی عرصے میں وہ ملیکنڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ یونیورسٹی اس وقت کئی طرح کے داخلی اور خارجی انتشار کا شکار تھی، اخبارات سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مزید تباہی سے بچانا مشکل ہوگا لیکن سید حامد صاحب کی آمد نے بہت جلد یونیورسٹی کی فضائے مسموم کو بہار میں بدل دیا۔ گرتے ہوئے تعلیمی اور انتظامی معیار نے از سر نو سنبھالا لے لیا، یونیورسٹی کا وقار، حکومت اور عوام کی نظر میں، بحال ہو گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا رشتہ اس عظیم درس گاہ سے پھر قائم ہو گیا۔ اس کے طلبہ و اساتذہ میں کام کرنے کی لگن پھر بیدار ہو گئی اور سید حامد کی سربراہی و قیادت میں ملیکنڈھ مسلم یونیورسٹی ایک بار پھر حقیقی معنوں میں یونیورسٹی ہو گئی۔

اس اثنا میں سید حامد صاحب نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور کئی قابل ستائش کام کیے۔ سر سید احمد خاں کے جاری کردہ رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ کو حیات نو بنی۔ اس سے بھی اہم کام، سید صاحب نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے دینی مدارس کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے نصاب پر نظر ثانی کروائی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے نظم و نسق کو ستوار اور استوار کیا، مختلف یونیورسٹیوں کے اعلیٰ درجات کی اسناد کے مساوی درجہ دلوادیا۔ ان اقدامات کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ سید حامد صاحب ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے باب میں کم و بیش وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے انیسویں صدی کے وسط

میں ادا کیا تھا۔

سید حامد صاحب، تقریر و تحریر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ کراچی کے چند روزہ قیام میں انھوں نے انجمن ترقی اردو، کراچی یونیورسٹی، اردو و کشتری بورڈ اور میگزین انسٹی ٹیوٹ کے اجتماعات میں ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ سیاسی و سماجی شعور اور تعلیمی و اقتصادی مسائل پر، جو بہت خطبات دیے وہ گہرا انگیز بھی تھے اور مطلوبات افزا بھی، ساتھ ہی ان کے ایک ایک لفظ سے ملک و ملت کے ساتھ ان کی درد مندی اور دل سوزی کا اندازہ ہوتا تھا، وہ جو کچھ کہہ رہے تھے حقائق و دلائل کے ساتھ کہہ رہے تھے اور جذبات و محسوسات کی ایسی بڑے خلوص شدت کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ ان کی بات سامعین کے دل و ذہن میں اُترتی چلی جاتی تھی۔ اچھے خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ سید حامد صاحب ایک ممتاز اہل قلم بھی ہیں۔ اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور علمی، ادبی و تعلیمی موضوعات کے ساتھ معاشی و سماجی مسائل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور درجنوں قیمتی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

غالب اور تصوف

غالب کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آج بھی برابر لکھا جا رہا ہے۔ وہ لکھنے والے جھکتے ہیں نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اس لئے کہ غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں مستقبل بینی کے حیرت انگیز نکات و رموز پنہاں ہیں۔ غالب نے ایک جگہ اپنے بارے میں کہا تھا کہ:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادِ خوار ہوتا

لیکن غالب کے اس اذعان کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی یعنی تصوف کے حوالے سے ان کے کلام اور شخصیت پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ البتہ بہت دنوں بعد ایک اچھی کتاب ”غالب اور تصوف“ میری نظر سے گزری جی چاہا اور ضروری جانا کہ اس کتاب کا تعارف قارئین نگار سے کرایا جائے۔

”غالب اور تصوف“ (مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) سید محمد مصطفیٰ صابری صاحب کی عالمانہ اور فلسفیانہ کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ صابری صاحب تصوف اور شاعری دونوں کے شانہ و معلوم ہوتے ہیں۔ جمعی انھوں نے اپنے موضوع سے ہر طرح انصاف کیا ہے اور غالب آگاہی کے ساتھ ساتھ تصوف شناسی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

دلی کے مشہور و ممتاز ناشر جناب محمد یحییٰ خان صاحب نے اپنے ادارے ”ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی“ سے کتاب ”عمدہ کاغذ پر جلد، بہترین سرورق کے ساتھ شائع کی ہے اور اردو

خدمتِ ولولہ دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس ادارے کے ذریعے پچھلے دس بارہ سال میں، اردو زبان ولولہ کے بارے میں بہت بڑی تعداد میں اور بہت بلند معیار کے ساتھ تحقیقی و تنقیدی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں اور اس کا امتیازی نشان چھن گئی ہیں۔ میں کتاب کے مصنف اور ناشر دونوں کی شکرگزاری کے ساتھ بطور تعارف، اس کتاب کے چند اجزاء انڈیا قارئین کو رہا ہوں۔

آخر میں ”غالب اور تصوف“ کے ناشر جناب ایم، ایم خان اور ان کے مطبوعاتی ادارے کے بارے میں بھی چند سطر ہیں۔ یہ سطر بہترین کتابوں کے حصول میں قارئین کے لئے آسانیاں پیدا کریں گی۔

(نگار، جولائی ۱۹۹۲ء)

کچھ غالب کے بارے میں

اس شمارے کو غالب کے حوالے سے فردری کا شمار ہونا تھا لیکن نہ جانے کیسے کیا ہوا کہ پریس کو جاتے جاتے مارچ اور فردری کے شمارے، ایک دوسرے سے بدل گئے۔

اس شمارے میں پانچ مقالات شامل ہیں اور پانچوں، غالب کے بارے میں ہیں۔ غالب کے بارے میں مدبر نگار پاکستان کے یہ مقالے پرانے نہیں نئے ہیں اور پچھلے تین برسوں کے اندر لکھے گئے ہیں۔

غالب، اردو کا ممتاز ترین شاعر ہے ہی لیکن میرا محبوب بھی ہے اس کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ اسی کے مطالعے نے مجھے تنجید و ادب کی طرف راغب کیا۔ میرا پہلا تنقیدی مضمون اکتوبر ۱۹۵۲ء کے شمار (گھنٹو) میں غالب کے کلام میں استفہام کے نام سے چھپا اور سارے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا، جگہ جگہ نقل ہوا، بار بار شائع ہوا، حوالے کی چیز بنا اور تنقید میں میرے قلم کو معتبر بنایا۔

۱۹۵۲ء کے بعد سے غالب کو میں نے مستقل موضوعِ سخن بنائے رکھا اور متعدد تنقیدی مقالات قلم بند کئے حتیٰ کہ ۱۹۶۹ء غالب صدی کے موقع پر ”غالب، شاعر امر دوز و فردا“ کے نام سے میری کتاب منظر عام پر آگئی اور میرے لئے انعام و توقیر کا وسیلہ بنی۔ پھر بھی میں غالب کے باب میں سیراب نہیں ہوا، غالب اور غالبیات پر برابر غور کرتا رہا اور غالب کی تفہیم کی نئی نئی راہیں و صورت تار رہا۔ یہ راہیں، تازہ مقالات کی صورت اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو غالب کے سلسلے میں بہت کچھ دیں گی اور غالب شناسی میں معاون ثابت ہوں گی۔

(نگار، مارچ ۱۹۹۵ء)

غالبیات

جون کا شمار دو سو سالہ جشنِ ولادت کے حوالے سے غالب اور غالبیات کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں نئے پرانے دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ وہ غالب کے بارے میں مزید غور و فکر اور مزید مطالعے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اُکساتے ہیں اور غالب سے متعلق اردو تنقید کا بے لاگ جائزہ لینے پر ناقدین کو متوجہ کرتے ہیں۔

یہ مضامین انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے سرمایہ ”اردو ادب“ بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۹ء مرتبہ ڈاکٹر اسلم پرویز سے لیے گئے ہیں اور ان کی اجازت اور شکریے کے ساتھ تذکرہ قارئین کیے جا رہے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کا ترجمان سرمایہ ”اردو ادب“ چوں کہ پاکستان کے قارئین ادب کے بہت مخصوص و محدود حلقے تک پہنچتا ہے، اور عام قاری اس کے مطالعے سے محروم رہتا ہے، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ غالب سے متعلق تازہ شمارے کے وہ چند مضامین جو غالب اور غالبیات کے بارے میں اہل فکر و نظر کو از سر نو سوچنے اور لکھنے کی دعوت دیتے ہیں، نگار کے قارئین تک ضرور پہنچا دیے جائیں۔

ہم نے اپنا کام کر دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کیا سوچتے ہیں کیا لکھتے ہیں اور غالب و غالبیات کے سلسلے میں کیا زاویہ نظر رکھتے ہیں۔

(نگار، جنوری ۱۹۹۹ء)

غالب سے متعلق کتابوں پر تبصرے

”احوال و نقد غالب“ مرتب محمد حیات خاں سیال، ناشر: نذر سنز، لاہور

کتابت و طباعت پاکیزہ، مردوق خوب صورت، کاغذ سفید، صفحات۔ ۸۴۰، مجلد قیمت دس روپے۔
غالب پر جو کتابیں اور مقالے شائع ہوئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی نہ تو لکھنے والے سیر ہوئے ہیں نہ پڑھنے والے۔ خدا جانے ان کے افکار و سودا شعار کے مختصر سے دیوان میں کتنے دواوین و کلیات کے مطالب سموئے ہوئے ہیں اور خدا جانے ان کی ہجڑ سالہ زندگی میں کتنی صدیاں اور کتنے عہد چھپے ہوئے ہیں کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برابر لوگ ان کے کلام کے ایک ایک نکتے اور ایک ایک خصوصیت کی تخریج کئے جا رہے ہیں اور ان کی زندگی کے ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحے کی تفصیل لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن سلسلہ ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جب کبھی ان کا دیوان دیکھئے اور جو کچھ ان پر لکھا گیا ہے، اس پر نظر ڈالئے تو یہی احساس ہوتا ہے جیسے ابھی ان کی شاعری اور شخصیت دونوں تازہ و تھیں و تھیں ہیں۔ شاید اسی احساس کے تحت محمد حیات خاں سیال نے اس طرف توجہ کی ہے اور غالب کی مکمل تصویر پیش کرنے کے شوق میں، منتخب تحریروں کے ذریعے ایک ایسی جامع کتاب مرتب کر دی جسے غالب پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں۔

کتاب دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ محمد حیات خاں سیال، تدوین و تدوین کتب کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کمال احتیاط سے غالب کی زندگی اور شخصیت کے سارے ایسے پہلوؤں کو

سامنے رکھا ہے جو غالب کو سمجھنے سمجھانے کے لئے از بس ضروری ہیں۔ پھر ان کی تشریح و تفسیم کے لئے ایسے مقالات انتخاب کئے ہیں جو ہر پہلو کو واضح کاف کر کے قاری کے سامنے لے آتے ہیں اور قاری کے ذوق و تندرست کو سیراب کر جاتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور انتخاب مقالات کے سلسلے میں مرتب کو کتنا کچھ پڑھنا پڑا ہوگا اور کتنی عرق ریزی و جانفشانی سے کام لینا پڑا ہوگا اس کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعے کے بعد ہی ممکن ہے۔ یقیناً ہے کہ یہ کتاب ہر حلقے میں مقبول ہوگی اور غالب شناسی و غالب جی کی نئی راہیں کھولے گی۔

(نور، جنوری ۱۹۶۶ء)

”روح المطالب فی شرح دیوان غالب“ اوشاداں بکرای (مرحوم)

کلام غالب کی ایک دو ٹیکس، درجنوں شرحیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ شارحین میں معنوی حیثیت کے بھی لوگ ہیں اور مولانا حسرت موہانی، نظم طباطبائی، بے خود بلوی، عبدالباری آسی اور علامہ نیاز فتح پوری جیسے بلند مرتبہ ادیب و شاعر بھی۔ لیکن کلام غالب کی افہام و تفہیم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ آئے دن ان پر ہوتا کچھ لکھا جا رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تکسی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت

شاداں بکرای کی ذریعہ نظر شرح دیوان غالب اسی سلسلے تفسیر کی اہم کڑی ہے اور اس کی اہمیت یوں زیادہ ہو جاتی ہے کہ بعض قدیم شرحوں سے استفادہ کے بعد تکسی لکھی گئی ہے۔ علامہ شاداں بکرای نے مولانا حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کی شرحوں کو خصوصیت سے سامنے رکھنا ہے اور جن پہلوؤں کو یہ حضرات تشدد چھوڑ گئے تھے۔ انہیں تفصیل و تشریح سے سیراب کر دیا ہے۔ جہاں جہاں مطالب میں اختلاف کی صورت پیدا ہوئی ہے وہاں وہاں اذول الذکر و دونوں کی رائیں نقل کر دی ہیں اور بعد ازاں اپنی رائے بھی ظاہر کر دی ہے۔ شاداں صاحب نے یہ بھی کیا ہے کہ ہر شعر کے مفہوم کے ساتھ ساتھ مشکل الفاظ و محاورات کے معنی بھی درج کر دیے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ قاری کو الفاظ و معنی کی جملہ خصوصیات و نکات کے ساتھ شعر سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ شرح کلام سے پہلے چوں کہ اس کتاب میں تسامحات و زلات کے نام سے کلام غالب کی بعض بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔ اس لئے اس میں شرح کے

ساتھ ساتھ تنقید کلام کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی اسی جامعیت سے توقع ہے کہ دوسری شرحوں کی طرح یہ بھی عام و خاص میں مقبول ہوگی۔

۶۱۸ صفحات کی یہ کتاب شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب لاہور سے بارہ روپے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

(نگار، مارچ ۱۹۶۸ء)

”نذر غالب“ مرتب، غلام جیلانی اصغر، ناشر، سرگودھا اکیڈمی

کتابت و طباعت، پاکیزہ، کاغذ سفید، صفحات ۱۳۳، قیمت ایک روپیہ

”نذر غالب“ جسے سلسلہ حسن غالب کی ایک کڑی کہنا چاہئے، انتخاب ہے ان منظومات و مقالات کا، جو سرگودھا اکیڈمی کی تقریبات غالب میں پڑھے گئے تھے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سکیل بخاری، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، قیوم شاکر، اختر امان، سجاد نقوی اور وقار انصاری نام شامل ہیں۔ یہ مقالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن بہ قامت بہتر یہ قیمت بہتر کے مصداق ہیں، ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ غالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے رسماً نہیں کہی گئیں بلکہ ان کا انداز اور پس منظر مقالہ نگاروں کے وسیع مطالعے اور گہرے سوچ بچار کا پتہ دیتا ہے، چنانچہ نذر غالب کی تحریریں، اپنے قاری کو سرسری نہیں گزرنے دیتیں بلکہ اسے کتاب کے لفظ بلفظ مطالعہ پر مجبور کر دیتی ہیں۔

منظومات میں ڈاکٹر وزیر آغا، رشید قیصرانی، غلام جیلانی اصغر، انور سدید اور بعض دوسرے

شعرا کی ایسی غزلیں شامل ہیں جو غالب کی زمین

”آج کچھ دوسرے دل میں سوا ہوتا ہے“

میں کہی گئی ہیں اور لطف سے خالی نہیں ہیں۔

(نگار، مئی ۱۹۶۹ء)

”نذر غالب“

غالب اور غالبیات سے متعلق پروفیسر عطاء الرحمن کا کوئی کی تکلیف کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:

- ۱- غالب بہ یک نگاہ
- ۲- غالب اقبال کی نگاہ میں
- ۳- غالب اپنے آئنے میں
- ۴- غالب میری نظر میں
- ۵- غالب کی فارسی غزل پر تفصیل
- ۶- غالب و غالب خنداں
- ۷- غزلیات بر زمین غالب

آغرائہ کرتوان کے تحت عطا کا کوئی کی انھیں غزلیں ہیں، یہ غزلیں غالب کی مشہور و مقبول زمیوں میں کہی گئی ہیں۔ ہر چند کہ کسی استاد کی زمین میں غزل کہنا، خصوصاً غالب جیسے ایجاد پسند مجزیباں شاعر کی زمیوں کو ہاتھ لگانا، ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن یہ غزلیں اپنے اندر کچھ ایسی دلکشی کا سامان رکھتی ہیں کہ ادب کا جاری غالب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ عطا کا کوئی کی قادر الکلامی اور فکر رسا کا بھی قائل ہو جاتا ہے۔

۹۶ صفحات کی کتاب عظیم الشان بک ڈیو پٹنہ نے سفید کاغذ پر شائع کی ہے۔ قیمت دو

روپے ہے۔

(نور، اگست ۱۹۶۹ء)

”فلسفہ کلام غالب“

غالب پر لکھنے کو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آج بھی برابر لکھا جا رہا ہے لیکن جانتے والے جانتے ہیں کہ غالب کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں چند گئے پتے اہل غم نے ہماری دہشتی کی ہے۔ انھیں گئے پتے لکھنے والوں میں ایک ممتاز نام ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ علم کلام، فلسفہ، ادبیات، علم لسان اور بیان و بلیغ پر

پچھلے اور ”فلسفہ کلام غالب“ کے عنوان سے ایک فکر انگیز کتاب لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

”فلسفہ کلام غالب“ اول اول اب سے اٹھارہ انیس سال پہلے غالب پر ایک چرچا دینے والی تصنیف کی حیثیت سے مظرعام پر آئی تھی اور چند برسوں میں نایاب ہو گئی تھی۔ زیر نظر کتاب اس کا تازہ ایڈیشن ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سارے مباحث پر مصنف نے از سر نو نظر ڈالی ہے۔ پہلے ایڈیشن پر مبصروں اور ناقدوں نے جو رائے دی تھیں ان سب پہلوؤں پر بحث کا اضافہ کیا ہے۔ جو پہلے ایڈیشن میں نظر انداز ہو گئے تھے، گویا تازہ ایڈیشن جسے نقش ثانی کہنا چاہئے نقش اول سے ہر طرح بہتر ہے اور غالب کو سمجھنے سمجھانے کی راہوں کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ کشادہ کر دیتا ہے۔

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فکر و خیال یا زبان و بیان کا کہیں اُلجھاؤ نہیں ہے۔ موضوع ہر چند کہ اوق تھا اور اس پر گفتگو بھی حدود درجہ مجیدہ، عالمانہ اور منطقی انداز سے ہی ہو سکتی تھی لیکن موضوع چونکہ سبزواری صاحب کے ذہن میں پوری طرح واضح تھا اور وہ اپنی بات کو مدلل بنا کر پیش کرنے میں قدرت بھی رکھتے ہیں، اس لئے انھوں نے بڑی آسانی سے موضوع زیر بحث کو دوسروں کے ذہن میں اُتار دیا ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو ڈاکٹر سبزواری کو غالب کے فکر و فن پر لکھنے والوں میں بہت ممتاز کر دیتی ہے۔

تین سو صفحات کی کتاب خوبصورت ٹائپ میں، سفید کاغذ پر، پاکیزہ طباعت و جلد بندی کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اہتمام شائع ہوئی ہے اور بارہ روپے میں مل سکتی ہے۔

(نگار، جون ۱۹۶۹ء)

”غالب: ۱۸۶۹ء-۱۹۶۹ء“

مصور، خطاطی اور حسن کلام غالب کا ایک قابل توجہ موقع ہے جو غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر، ڈائری کے روپ میں یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کراچی کے ذریعہ اہتمام مظرعام پر آیا ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک دوئیس سیکڑوں چیزیں مظرعام پر آئی ہیں۔ غالب پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور مقالات شائع ہوئے ہیں، دیوان غالب اور کلام غالب کے

منتخبات چمپے ہیں، غالب کے کلام اور نثر کے ترجمے کئے گئے ہیں، ادبی رسائل نے غالب نمبر نکالے ہیں، ادبی انجمنوں نے سہ ماہی اور مذاکرے منعقد کرائے ہیں۔ غالب کے نام کے کیلنڈر جاری کئے گئے ہیں اور بہت سی چیزیں ان کے نام سے منسوب کر کے بطور خراج تحسین اس موقع پر پیش کی گئی ہیں، یہ سب چیزیں قابل توجہ ہیں لیکن ان سب کا دائرہ اثر محدود ہے۔ زیر نظر ڈائری البتہ اس نوع کی چیز ہے جو اپنی گونا گوں خوبیوں کے سبب عام و خاص سب کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔ اس کے ذریعہ غالب کا نام اور کلام پاکستان سے باہر دوسرے ملکوں تک پہنچا ہے اور اس حسن سلیقہ کے ساتھ کہ غالب کی روح، اس سے ضرور خوش ہوئی ہوگی۔

پوری ڈائری بڑے سائز میں ویز آرٹ کاغذ پر شائع کی گئی ہے اور شروع سے آخر تک غالب کی ایک نظر گیر تصویر ہے، یہ تصویر غالب کے مزاج، لباس، شکل و صورت، انداز نشست و کتابت اور ماحول سب کی ترجمان ہے۔ اس تصویر میں صرف سادہ کپڑوں سے کام لیا گیا ہے لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اگر کسی باذوق کے ہاتھ میں آ جائے تو سب لکیریں ہاتھ کی رگ جاں بن جائیں۔ اس کے بعد غالب کے ہاتھ کی تحریر کا نمونہ اور غالب پر اقبال کی مشہور نظم ہے، درمیان میں صادقین صاحب کے بتائے ہوئے تصویر کی مرتقے ہیں۔ یہ مرتقے غالب کے بعض اشعار کی محاکاتی تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں اور ناظرین کے دلوں پر غالب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ مضمر کی فنی عظمت کا سکہ بھی بنیاد دیتے ہیں۔ ہر صفحے کے چار حصے ہیں، چوتھا حصہ انتخاب کلام غالب کے لئے مخصوص ہے اور غالب کے فکر و فن کے ساتھ ساتھ خطاطی کی بڑائی کا بھی احساس دلاتا ہے، مختصر یہ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ڈائری کیا ہے، شعر و مضمری و فن خطاطی کا ایک قیمتی مرتع ہے اور مرتبین کی نکاست طبع، ذوق لطیف اور حسن سلیقہ کا آئینہ ہے، یقین ہے کہ فنون لطیفہ کا یہ شاہکار ایک طرف یونائیٹڈ بینک کے نام کو ادا نچا کرے گا۔ دوسری طرف دوسرے اداروں کو اس قسم کے کام کے لئے اکسائے گا۔

”غالب اور مطالعہ غالب“

پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر اور پاکستان کے ممتاز صاحبِ قلم ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تصنیف ہے۔ غالب کے متعلق ادھر متحدہ کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ سیکڑوں مقالے لکھے گئے ہیں اور اکثر ادبی رسائل کے ”غالب نمبر“ شائع کئے گئے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں ساری چیزیں کام کی نہیں ہیں، ہاں ایک منتخب حصہ ایسا ضرور ہے جسے تحقیق و تنقید کے لحاظ سے معیاری ادب کا درجہ دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی زیر نظر تصنیف اسی منتخب حصے کے تحت آتی ہے اور قارئین کو متحدہ وجود سے اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو شروع ہی سے غالب کی ذات و صفات سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس دلچسپی کا ایک واضح ثبوت ان کا وہ مقالہ ہے جو علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اب سے کوئی بیس بائیس سال پہلے شائع ہوا تھا، اس مقالے میں عبادت صاحب نے غالب کے فکر و فن کو ایک خاص زاویے اور ایک خاص انداز سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ زیر نظر کتاب اسی کوشش کی عملی صورت ہے۔

ڈاکٹر عبادت نے اس کتاب میں غالب کی زندگی، شخصیت، ماحول، تصانیف، شاعری، شاعری کی عظمت، خطوط، کی ادبیت و اہمیت اور غالب کے اہم ناقدین سب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ایسی تفصیل و توضیح کے ساتھ کہ غالب کی زندگی اور فن کا ہر پہلو پوری طرح بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ سادگی اور وضاحت اور تجزیہ و تحلیل جس سے عبادت کا انداز تحریر عبادت ہے۔ یہ اس کتاب میں بھی ہر ورق پر نمایاں ہے اور قاری کے آسودگی و ذوق کا پورا سامان فراہم کرتا ہے۔

۵۰۰ صفحے کی جلد کتاب خوبصورت نائپ میں سفید کاغذ پر دیدہ و زیب سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور بیس روپے میں رائلٹرا کیڈامی لاہور سے مل سکتی ہے۔

(نمبر ۱، اگست ۱۹۶۹ء)

”ہنگامہ دل آ شوب“

”ہنگامہ دل آ شوب“ غالب اور غالبیات سے متعلق ایک نہایت دلچسپ اور اہم کتاب ہے، اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ نثر ہاں قاطع کی رو میں جب غالب نے ”قاطع برہان“ لکھی تو دونوں کتابوں کی تائید و تردید کا ایک طویل سلسلہ چھڑ گیا اور ادب کے سارے عام و خاص قاری اس میں کسی نہ کسی طور پر شریک ہو گئے۔ بحث کا آغاز اگرچہ علمی و ادبی مجیدہ نثر سے ہوا تھا۔ لیکن آگے بڑھ کر مظلوم تحریریں بھی دونوں جانب سے شائع ہونے لگیں اور ان تحریروں میں سنجیدہ و غیر سنجیدہ ہر قسم کا ب دلچسپ و در آیا۔ گویا لغت کے سلسلے کا یہ ایک علمی مناظرہ یا مباحثہ نہ تھا بلکہ ادبی ہنگامہ تھا جس نے کسی ایک شہر کو نہیں بلکہ کٹر شہروں کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا، اس لحاظ سے جس نے بھی ”نثر ہاں قاطع“ اور ”قاطع برہان“ کی ساری بجٹوں کو کجا کر کے کتابی صورت میں اسے ”ہنگامہ دل آ شوب“ کا نام دیا ہے بہت موزوں نام دیا ہے۔

”ہنگامہ دل آ شوب“ اول اول ۶۶ء میں کتابی صورت میں اور بعد ازاں سید عطا حسین کے توسط سے جنوری ۱۹۳۷ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوئی۔ اس کی تالیف اور اہمیت کے پیش نظر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے اسے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ کتاب فی ثقب بہت اہم ہے لیکن کتاب کے مرتب سید قدرت نقوی نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ کتاب کے تعارف کے سلسلے میں ان کا محیط مقدمہ اصل کتاب میں مذکورہ شخصیتوں کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور بعض امور و مسائل کے سلسلے میں ان کی توضیحات، ایسی چیزیں ہیں جو ایک طرف کتاب کی افادیت کو بڑھاتی ہیں تو دوسری طرف مرتب کی عرق ریزی اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

۱۹۲ صفحات کی جلد کتاب سات روپے میں انجمن ترقی اردو کراچی سے مل سکتی ہے۔

(نگار، اگست ۱۹۶۹ء)

سہ ماہی ”صحیفہ“ غالب نمبر، (حصہ اول، دوم، سوم)

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی ناشر: مجلس ترقی ادب، لاہور

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر اردو کے سارے ادبی پڑھوں نے غالب نمبر شائع کئے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ہر نمبر میں کچھ باتیں کام کی ہیں، لیکن ان میں ایسے پڑے بھی ہیں، جن کا بیشتر حصہ رطب و یابس اور طوالت ہے جاپا بکھرا محض کے تحت آتا ہے۔ چند پڑھوں کے غالب نمبر الہیت ایسے ہیں جو غالب اور غالبیات کے سلسلے میں لوح سے تحت تک ”داسن دل می کشد“ کے مصداق ہیں، انہیں میں ایک نام ”صحیفہ“ کا ہے، بلکہ جھجک کو دوسرے پڑھوں پر یوں فوقیت حاصل ہے کہ اس نے ۱۹۶۹ء کی ساری اشاعتوں کو غالب کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس کے تین شمارے غالب نمبر، حصہ اول، غالب نمبر، حصہ دوم اور غالب نمبر، حصہ سوم منظر عام پر آچکے ہیں۔ چوتھا شمارہ زیر ترتیب ہے۔ گویا، مجید، نے غالب کی شخصیت اور فن کے جملہ پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش ایسی کامیاب ہے کہ دوسرے پڑھوں کے لئے قاطبی رشک ہے۔ مجید کے لکھنے والوں میں چونکہ بیشتر وہ لوگ ہیں جنہیں ماہر غالبیات کی حیثیت حاصل ہے یا وہ جنہوں نے برسوں کے مطالعہ کے بعد غالب کی شخصیت اور فن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی ہے۔ اس لئے مقدار و معیار، ہر لحاظ سے ”صحیفہ“ کے غالب نمبر، موضوع زیر بحث کے سلسلے میں مستند تاریخی دستاویز بن گئے ہیں۔ پہلا حصہ دس روپے، دوسرا حصہ دو روپے پچاس پیسے اور تیسرا حصہ دو روپے پچاس پیسے۔

(انکار، اکتوبر ۱۹۶۹ء)

”محاسن کلام غالب“ از ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم

ناشر: فخری پرنٹنگ پریس، کراچی

کاغذ سلیڈ، نائپ خوبصورت، طباعت نفیس۔ قیمت: چار روپے

اس سال غالب کے چھٹی صد سالہ کے بہانے غالب کے سلسلے میں متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اردو کے اکثر رسائل نے غالب نمبر شائع کئے ہیں، بعض پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو غالب اور غالبیات کی ساری

تصنیف و تالیفات کے ذخیرے میں دو کتابیں اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک مولانا حالی کی ”یادگار غالب“

دوسری ڈاکٹر بجنوری کی ”محاسن کلام غالب“

یہی دو کتابیں ہیں جن کی اشاعت کے بعد ہم نے غالب کو پہچانا ہے۔ ان کو ذوقی سے بڑا شاعر مانا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہوئے ہیں ان کی زندگی اور کلام سے ہماری دلچسپی بڑھی ہے۔ ہم نے ان کی تصانیف و مجموعہ ہائے کلام کا کھوج لگایا ہے اور ان کی آفاقی و شاعرانہ حیثیت سے متعارف ہونے اور متعارف کرانے کی کوشش کی ہے، یہ کوشش جو حالی اور ڈاکٹر بجنوری سے شروع ہوئی تھی، آج تک جاری ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ غالب کے سلسلے میں ہزاروں صفحے لکھے جانے کے بعد بھی نہ تو یادگار غالب جیسی اب تک کوئی کتاب منظر عام پر آئی اور نہ ”محاسن کلام غالب“ جیسا مقالہ شائع ہوا۔ ”محاسن کلام غالب“ مقالے کی صورت میں لاول اول ۱۹۳۱ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوا پھر نیر حمید یہ اور دوسرے رسائل کی ترغبت بنا۔ بعد ازاں انجمن ترقی اردو ہند سے چھاپا لیا۔ اس کے بعد غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر یہ مقالہ بعض غالب خبروں میں شامل کیا گیا۔ لیکن کتابی صورت میں اس کا کوئی مفید اور خوبصورت ایڈیشن منظر عام پر نہ آ سکا تھا، زیر نظر ”محاسن کلام غالب“ کے فخری ایڈیشن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

کتاب کی طباعت، ٹائپ کے انتخاب، جلد بندی اور سرورق کی تزئین سب میں حسن طبع کا ثبوت دیا گیا ہے، بلکہ اس نسخے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو ہر طرح سے مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ رسالہ اردو نیر حمید یہ اور دوسرے مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کے متن کی اصلاح کی گئی ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کتاب ”خلل نامہ“ کے ہدف نامہ داغ سے محفوظ ہو گئی ہے، یقین سے کہ محاسن کلام غالب کا فنی صدی ایڈیشن جسے مالکان فخری پریس کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی سری کرنا چاہئے۔ غالب کے احوں میں خصوصاً اور اولیٰ صورت میں عموماً قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے کا۔

(نگار ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

”غالب کون ہے؟“

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں اردو کے ممتاز اہل قلم سید قدرت نقوی نے غالب کی زندگی اور فن پر عالمانہ بحث کی ہے اور غالب کو حقیقی خال و محط کے ساتھ ہمارے سامنے لے آتے ہیں، سید قدرت نقوی اردو کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو گہرے مطالعہ کے بغیر کسی موضوع پر قلم نہیں اٹھاتے۔ نتیجہً اُن کی تحریریں ہر حلقے میں شروع ہی سے وسیع خیال کی جاتی ہیں۔ غالب پر انھوں نے ایک دوئیں درجنوں مضامین لکھے ہیں اور ان میں سے کوئی مضمون ایسا نہیں جسے حرف مکر یا نکرار بے جا سے تعبیر کیا جاسکے ہر جگہ انھوں نے ایسی دقیقہ نظر اور وسعت مطالعہ کا ثبوت دیا ہے کہ ان کا نام غالبیات کے سلسلے میں بہت اہم ہو گیا ہے۔

زیر نظر کتاب سات مضامین پر مشتمل ہے۔ ابتدائی مضمون غالب کی زندگی اور آخری چار غالب کے فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر مضمون صاحب کتاب کے علم و فضل اور قوت نقد و تحقیق کا مرقع ہے اور غالب و کلام غالب کے بعض ایسے گوشوں کو نور کرتا ہے جو اس سے پہلے ذہن لے اور غیر روشن تھے، یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف غالب کے طرف داروں بلکہ خن فہموں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور صاحب کتاب کی بصارت و بصیرت کا سکہ بٹھائے گی۔

۲۰۸ صفحوں کی کتاب، مضبوط جلد، دیہ وزب سردرق اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے اور چھ روپے میں وائش کدہ حسین آگاہی ملتان سے مل سکتی ہے۔

(انکار، نمبر ۷۷، ۱۹۷۷ء)

”نقوش، غالب نمبر“ (حصہ دوم)

غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر اردو کے بیشتر پڑھوں نے غالب نمبر شائع کئے ہیں اور اس سے انکار نہیں کہ ہر نمبر کسی نہ کسی طور پر افادیت کا مالک ہے۔ پھر بھی نقوش کے غالب نمبر (حصہ اول) کی حیثیت ان نمبروں میں بھی خاص الخاص کی تھی۔ لیکن نقوش (غالب نمبر حصہ دوم) جو کہ غالب کی نو رو یافت بیاض پر مشتمل ہے اور اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، بلحاظ افادیت و اہمیت دوسرے پڑھوں کے سارے غالب نمبروں کو جیتی کہ خود نقوش کے حصہ اول کو بھی مات کر گیا۔

پچھلے سال جب یہ خبر ملی کہ دیوان غالب کا ایک ایسا نکلے نسخہ ہاتھ آ گیا ہے جو سارے موجودہ نسخوں سے پرانا ہے تو ادبی حلقوں میں عموماً اور غالب کے طرفداروں میں خصوصاً خوشی کی ایک لہری دوڑ گئی لیکن اہل پاکستان کے لئے یہ خوشی ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب کا انداز لئے ہوئے تھی۔ سبب یہ تھا کہ یہ قدیم ترین نسخہ ہندوستان میں دریافت ہوا تھا اور غالب کی برسی کے موقع پر اس کے پاکستان پہنچنے کے امکانات نہ تھے۔ خدا بھلا کرے محمد طفیل مدیر نقوش کا جنوں نے اس نسخے کی فوٹو اسٹیٹ نقل حاصل کی اور اسے بہت جلد غالب نمبر حصہ دوم کی صورت میں منظر عام پر لے آئے اور ہماری بے چینی کو روحانی مسرت میں بدل دیا۔ حق یہ ہے کہ موجودہ صورت میں نقوش کا غالب نمبر غالیات کے سلسلے میں سب سے اہم اور قیمتی دستاویز ہے جو ہم تک پہنچا ہے اور اس سلسلے میں مدیر نقوش کے ہم جس قدر شکر گزار ہوں کم ہے۔ مدیر نقوش نے یہ بہت اچھا کیا کہ ایک صفحے پر اصل نسخے کی فوٹو اسٹیٹ نقل دے کر اس کے سامنے دوسرے صفحے پر متن کو نستعلیق میں منتقل کر دیا۔ اس سے یہ ہوا کہ اصل نسخہ عدد درجہ کارآمد ہو گیا اور غالب و کلام کے مطالعہ کی نئی راہیں نکل آئیں۔ رہی اس قدیم نسخے کی دریافت کی کہانی اور اس کی افادیت و اہمیت کی دوسری تصریحات، سو یہ بھی مولانا ایجاز علی خاں عرشی اور ثار احمد فاروقی کے مقالات مشمولہ نقوش غالب نمبر حصہ دوم (نور یافتہ بیاض) میں ملت آئی ہیں اور نقوش کا اب یہ نمبر صرف ایک نمبر نہیں رہا بلکہ غالیات کے سلسلے کی سب سے قیمتی اور اہم دستاویز بن گیا ہے۔

۳۸۳ صفحے کا یہ دیدہ زیب اور قیمتی مجید صرف تیس روپے میں مل سکتا ہے۔

(نگار، ستمبر ۱۹۷۷ء)

”ادب لطیف (غالب نمبر)“ مدیر: ناصر زیدی۔ صفحات: ۳۴۰۔ قیمت: ۵ روپے

ایک زمانہ تھا کہ ”ادب لطیف“ اردو کے چند گئے چنے معیاری پرچوں میں شمار ہوتا تھا اور اس میں کسی کے نام کا چھپنا بڑے فخر کی بات بھی جاتی تھی لیکن مرزا ادیب کے جانے کے بعد، اس پر ڈال آیا مدد گئی سال تک اس کی اشاعت ایسی ڈانواں ڈول رہی کہ، بظاہر اس کے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا لیکن ایسے موقعوں پر آپ جانتے ہیں کہ ”مردے از غیب بروں آید و کارے کند“ بھی ہوا، ایک جواں سال اور باعزم شاعر و ادیب ناصر زیدی سامنے آئے اور ”ادب لطیف“ کے

مردہ جسم میں ایک بار پھر تازہ روح پھونک دی۔ اس تازہ روح کی تازگی کا تازہ ترین ثبوت ”اس کا زیرِ نظر شمارہ“ غالب نمبر ہے۔

غالب کے جن صد سالہ کے موقع پر ہر پرچے نے ”غالب نمبر“ شائع کیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ کوئی پرچہ افادی پہلوؤں سے خالی نہیں ہے۔ ”اویس لطیف“ کی بھی یہی صورت ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ غالب کے فکر و فن کے بارے میں موضوعات اور مولوی رنگارنگی کی بدولت اس پرچے کی افادیت میں بھی ایک طرح کی انفراسیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس خاص نمبر کو مندرجہ ذیل خاص ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) دروازہ خانہ کھلا۔ (۲) رھکِ فارسی۔ (۳) نقشِ ہائے رنگ۔ رنگ۔ (۴) ذکر اس پر پی ویش کا (۵) پردہ ساز۔ (۶) گلِ نف۔ (۷) شوخیِ تحریر۔ (۸) حکایتِ خوشچکان۔ (۹) بھنورِ غالب اور اس انجمنِ گل میں۔۔

گویا ابواب کے عنوانات کا انتخاب بھی کلامِ غالب سے کیا گیا ہے۔ ابتدائی تین حصوں میں، غالب کی اردو، فارسی شاعری کا انتخاب ہے۔ ایسا انتخاب، جس میں انتخاب کرنے والے کی رسوائی کا خطرہ نہیں ہے اور یہ کوئی کم اہم بات نہیں ہے۔ ”ذکر اس پر پی ویش“ کے تحت، غالب کی زندگی اور فکر و فن سے متعلق مقالات ہیں اور اپنی کیفیات و اطلاعات کے لحاظ سے، ان میں بعض بالکل نئے ہیں۔ اس کے بعد ”خراجِ حقیقت“ کے طور پر غالب کے حضور میں متعدد شعراء کی نظمیں اور بعد ازاں غالب کی غزلوں پر غزلیں ہیں۔ ”شوخیِ تحریر“ کے عنوان سے حراج کا عنصر لئے ہوئے مضامین و منظومات ہیں۔ ”حکایتِ خوشچکان“ کے تحت، تقریباً غالب کے سلسلے کا ایک طویل پرچہ لٹا ہے، ان تفصیلات سے اعذارہ کیا جاسکتا ہے یہ خاص نمبر کتنا رنگارنگ ہے اور اس کی یہی رنگارنگی اسے دوسرے غالب نمبروں سے ممتاز کرتی ہے۔

(نگار، جبر ۷۷ء)

”دیوان غالب (نسخہ حمید یہ)“ مرتب: پروفیسر حمید احمد خاں
ناشر: مجلس ترقی ادب، لاہور

”نسخہ حمید یہ“ دیوان غالب کا وہ نقلی نسخہ ہے جو بمبھو پال کے کتب خانہ حمید یہ میں دستیاب ہوا اور مفتی انوار الحق کی ترتیب و مقدمہ کے ساتھ ۱۹۴۱ء میں پہلے پبلک طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ نسخہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ ۱۸۴۱ء میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۵، ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی۔ غالب کی شخصیت اور اعداد و کلام کی بہت سی تاشکبادہ گر ہیں وراصل اسی نسخے نے نکھولی ہیں۔

اس نسخے کی از سر نو اشاعت دو سبب سے بہت ضروری تھی اول یہ کہ نسخہ حمید یہ مرتبہ مفتی انوار الحق ایک مدت سے نایاب تھا اور اس سے استفادہ کرنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی، دوسرے یہ کہ مفتی صاحب کے نسخے میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جن کا ازالہ بہت ضروری تھا۔ یہ کام ہر ایک کے بس کا نہ تھا، سخت جان کا اسی دورِ ہریزی چاہتا تھا اور ایک ایسے صاحبِ قلم کا طالب تھا جو جن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کا طرف دار بھی ہو۔ خوش قسمتی سے مجلس ترقی ادب لاہور کو حمید احمد خاں صاحب کے روپ میں یہ آوی مل گیا اور جس کام کو ہم نے آپ نے مشکل سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اُن کے ہاتھوں بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا گیا، مجھے یقین ہے کہ غالب کی روح، اس کام سے بالخصوص خوش ہوئی ہوگی۔

نسخہ حمید یہ مرتبہ مفتی انوار الحق کے متن و ترتیب میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، پروفیسر حمید احمد خاں نے صرف یہی نہیں کہ وقتِ نظر کے ساتھ انہیں دور کیا ہے بلکہ ایک محیط مقدمہ کے ذریعہ نسخہ حمید یہ کی اہمیت پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے، مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے شائع بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے، اس میں طباعت و کتابت کی وہ کمزوریاں نہیں ہیں جو نسخہ حمید یہ کی اولین اشاعت میں نظر آتی ہیں۔ کتاب خوب صورت ٹائپ میں دبیز کاغذ کے ۲۹۰ صفحات میں چھپی ہوئی ہے اور پندرہ روپے میں مل سکتی ہے۔

(نگار مہجی۔ جون ۱۹۷۷ء)

”غالب اور انقلاب ستاون“ از ڈاکٹر معین الرحمن
ناشر: سبک میل پبلی کیشنز، لاہور

مجلد، خوبصورت سرورق، کاغذ سفید، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۱۶، قیمت چند روپے۔

غالب اور غالبیات پر ایک دو نہیں سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ لکھنے والے جھکتے ہیں نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے کہ غالب کا ہر بالغ نظر نگار اس کی شخصیت اور کلام سے کوئی ایسا اچھا پہلا اپنی گفتگو کے لئے نکال لیتا ہے کہ وہ علم و ادب کے قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، کم از کم بد نظر کتاب کی بھی صورت ہے۔ اس میں ڈاکٹر معین الرحمن نے غالب کی زندگی اور فکر و نظر کے بارے میں بعض ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جو ابھی تک غالب کے عام قاری ہی سے نہیں خاص سے بھی پوشیدہ تھیں۔ ہر چند کہ کتاب کی اساس غالب کی مشہور کتاب ”دہلیو“ پر قائم ہے لیکن مصنف نے ”دہلیو“ کے حوالے سے غالب کے مطلق اتنا قیمتی اور نیا مواد اس کتاب میں جمع کر دیا ہے کہ جو لوگ غالب کے ذہن کوئی الواقع پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ غالب نے دہلیو کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران روزنامے کے اعزاز میں لکھا تھا لیکن کچھ ایسے بدبختوں کے ساتھ کہ ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں میں مرضی بنے رہ سکیں اور دوسری طرف فرنگی حکمرانوں کی خوشنودی بھی حاصل کر سکیں۔ ایک حیر سے دو فکار کرنے کے لئے انھوں نے دہلیو کو کس اعزاز سے مرتب کیا تھا اور اس کے لئے قاری کا کوئی اسلوب اختیار کیا تھا اس کی تفصیل اس جگہ ممکن نہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کا صحیح اعزاز ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمن نے دہلیو کو پہلے اردو میں منتقل کیا پھر اس ترجمے کو ضروری حواشی و تہلیحات اور مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس طرح ”دہلیو“ کے مطالب و مباحث تک عام و خاص سب کی رسائی ہو گئی اور غالب کے بارے میں کئی ایسی باتیں سامنے آئیں جو صرف غنی نہیں بلکہ ہمیں و حیرت انگیز بھی ہیں۔ دہلیو کو اردو میں منتقل کرنا۔ اس کے نکات کو سمجھنا اور اس کے منظر اور پس منظر پر روشنی سے گفتگو کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف چونکہ غالبیات کے بی ایچ ڈی ہیں اور غالب کا مطالعہ ان کی ادبی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا ہے اس لئے وہ اس مشکل کام سے پہ آسانی گزر گئے ہیں اور غالب پر

ایک ایسی کتاب دے دی ہے جو غالب کے سلسلے میں کئی کتابوں کی محرک بن سکتی ہے۔
(نگار، جنوری ۱۹۷۷ء)

”حیاتِ غالب کا ایک باب“

غالب بھی اردو کا عجیب شاعر ہے، نہ لکھنے والے سمجھتے ہیں نہ پڑھنے والے۔ پڑھنے والوں کا کمال یہ ہے کہ وہ غالب پر لکھی گئی ہر اچھی بُری تحریر سے واقف رہنا چاہتے ہیں اور لکھنے والوں کی جگر داری یہ ہے کہ وہ غالب کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے ہیں کہ ادب کے طالب علموں اور غالب کے طرف داروں کو بہر حال اس طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تازہ کتاب کی یہی صورت ہے۔ یہ اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے بالکل اچھوتی کتاب ہے اور حیاتِ غالب کی جزئیات سے شناسائی کے سلسلے میں غیادہی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

غالب کی بخش کا قصبہ، غالب کی زندگی کا ایک بہت دلچسپ اور اہم باب ہے۔ اس کا ذکر غالب کے اکثر سوانح نگاروں نے کسی نہ کسی طور پر کیا ہے لیکن قصبے کی دستاویز تفصیلات پہلی بار ڈاکٹر ملک حسن اختر کے ذریعے سامنے آئی ہیں۔ یہ دستاویزیں پنجاب آرکائیوز میں پڑی تھیں، جنہیں ڈاکٹر حسن اختر کی نگاہ دور رس نے ڈھونڈ نکالا اور یہ ایک ہیضہ مقدس کے ساتھ مکتبہ عالیہ لاہور کی معرفت منظرِ عام پر آ گئیں۔ کیا عجب کہ اس سے حیاتِ غالب کے سلسلے میں تحقیق کے نئے امکانات پیدا ہوں اور تنقیدِ غالب کے لئے نئی راہیں ہموار ہوں۔

(نگار، اکتوبر ۱۹۷۸ء)

”اشاریہ غالب“

مرتب: سید مصین الرحمن

ناشر: مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

خوبصورت نائپ، عمدہ طباعت، سلیڈ کاغذ، جلد، صفحات ۳۹۰، قیمت درج نہیں ہے۔

ادھر پچھلے دو سال، غالب کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر، غالبیات کے سلسلے میں اتنا زیادہ کام ہوا ہے کہ اقبالیات کو بھی مات کر گیا ہے۔ پاک و ہند کے سارے ادبی پرچوں نے غالب نمبر شائع

کئے ہیں، خدا کرے اور مباحثے منعقد ہوئے ہیں، تعنیفات غالب کے ایک دو نہیں درجنوں اڈیشن شائع ہوئے ہیں، خود غالب اور کلام غالب سے متعلق سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں مقالات لکھے گئے ہیں۔ یہ تو پچھلے دو سال میں ہوا ہے، اس سے پہلے سرسہ سال میں غالبیات کے سلسلہ میں کتنا کام ہو چکا ہے، اور اس کی کیا نوعیت ہے، اس کا اندازہ کر لینا عام کیا خاص آدمیوں کی بھی بس کی بات نہیں تھی، اس سارے کام کے معیار و معیار کو سمجھا کرنے اور اسے کتابی صورت میں آئینہ دکھانے کے لئے ایک پورے ادارے کی ضرورت تھی لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس دیہ قامت کام کو پروفیسر سید معین الرحمن نے تنہا انجام دے دیا اور اتنی جامعیت و خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس سے بہتر کی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی۔

”اشاریہ غالب“ کی نوعیت کا کام پاک و ہند میں بعض دوسرے افراد نے بھی کیا ہے، لیکن صرف یہی نہیں کہ دوسروں کا کام، غالبیات کا پورا احاطہ نہیں کرتا بلکہ نوعیت و حیثیت کے لحاظ سے بھی کم رتبہ ہے اور تحقیق و تنقید کے سلسلہ میں اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا، سید معین الرحمن کے کام، یوں بہت اہم ہے کہ تحقیق کی وقت نظری اور تنقید کی ڈرف نگاہی، دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ ہر مضمون، ہر کتاب اور ہر رسالہ پر براہ راست نظر ڈالنے اور اس کی اشاعت کی ضروری تفصیلات دینے کے بعد اس کا مخلص بھی دے دیا گیا ہے، یہ مخلص اس نوع کا ہے کہ قاری کو اصل کام کے مطالعے سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے غالبیات کے سلسلے کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔ آج تک غالب کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ سب اس کتاب میں بالاختصار آ گیا ہے اور غالب سے متعلق ہر قسم کی معلومات اس میں دستیاب ہو جاتی ہے۔ کتاب تین جلدوں میں تیار کی گئی ہے، جس کی پہلی جلد زبور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ یقین ہے کہ غالب کے سلسلے میں اس کتاب کے ذریعہ تحقیق و تنقید کا ایک نیا باب کھلے گا اور غالب کے نام اور کام کو اور اونچا کرے گا۔

(لکار، ستمبر ۱۹۷۷ء)

غالب سے متعلق کتب اور مصنفین کا تعارف

مولانا حامد حسن قادری مرحوم اور غالب شناسی

اب سے کوئی سولہ سترہ سال پہلے کی بات ہے ”رقیب“ کے معنی دیکھ رہا تھا، کسی لغت میں تھا، محافظ و نگراں، کسی میں ”پاساں و خطر اور کسی میں دشمن و مد مقابل، ایک ہی لفظ کے معنی میں یہ تضاد کچھ سمجھ میں نہ آیا، میں نے غائبانہ قییدت کی بنا پر مولانا سے رجوع کیا آپ نے جواب میں لکھا:

”رقیب کے اصل معنی، محافظ و نگہبان و خطری کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نام رقیب

ہے، اللہ نے اپنے کو رقیب کہا ہے، پیغمبر صاحب کو رقیب کہا ہے، قرآن میں کئی

جگہ رقیب کا لفظ آیا ہے، جیسے ”ان اللہ علی کل شیء رقیباً“ لیکن عاشق کا رقیب مرئی

میں نہیں ہے۔ اردو میں ہے، مگر بے سبب نہیں، رقیب وہ شخص بھی ہوا جو دیکھتا اور

ناکھرا رہتا ہو کہ کوئی کیا کر رہا ہے، محبت کے رقیب بھی یہی کام کرتے ہیں اس لئے

اردو میں رقیب کے معنی بہت مختلف ہو گئے۔“

اسی طرح ایک خط میں، میں نے پوچھا ”یہ کیا بات ہے کہ بعض خط و خال یا خال و خط لکھتے ہیں اور

بعض خال و خند یا خند و خال کیا دونوں طرح درست ہے جواب آیا:

”خط و خال یا خال و خط ہی درست ہے، خند و خال یا خال و خند غلط، اردو اور فارسی

میں یہ محاورہ طبع و طبیعت اور آرائش و زیبائش کے معنوں میں آتا ہے۔ فارسی

شعراء نے خط و خال ہی ہمیشہ استعمال کیا ہے، خند و خال کی، کوئی مثال نہیں ملتی،

اردو میں یہ لفظی انقلاب پسندوں کے ہاتھوں آتی ہے۔ جو جس صاحب کا شعر ہے:

خال و خند سے چہ پہائے ضعف نازک آفتاب

کر زنی چہروں پہ زن بننے کے ارماں ہے قرار
لیکن عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، میں نے نقد و نظر کے کسی مضمون میں اس محاورہ پر
تفصیل سے بحث کی ہے، دیکھ لیجئے۔“

یہ ایک انجینی کے غلطوں کے جوابات تھے لیکن جدوجہد شافی ثبوت آمیز، دل خوش کن، چٹا خچہ اس کے
بعد جب بھی اس قسم کی الجھن سامنے آتی، مولانا کو لکھتا، مولانا جلاتا خیر جواب لکھ بھیجتے اور دعا کہیں
اوپر سے دیتے، پھر یہ سلسلہ رکی سے غیر رکی بن گیا اور برسوں جاری رہا۔ مولانا کے کراپتی آ جانے
کے بعد، مراسلے کا سلسلہ بند ہوا تو خوش قسمتی سے مکالمہ ملاقات کی صورت نکل آئی، چٹا خچہ کراپتی
میں ان سے ایک ہارنٹیں پار پار مل کر مٹی خوش کیا اور کچھ نہ کچھ لے کر اٹھا۔

مولانا حامد حسن قادری اردو کے معلم و ادیب تھے، محقق و نقاد تھے، مورخ و تاریخ گو تھے،
شاعر اور علم عروض و بدیع کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور اردو سب پر یکساں
دسترس رکھتے تھے، مجھے پرے سے کا نام یاد نہیں آ رہا، لیکن مولانا خود کہا کرتے تھے کہ میری اولین تحریر
۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء میں، پنجاب کے کسی پرے میں شائع ہوئی تھی، اس طرح کم و بیش ساٹھ سال،
انھوں نے اردو کی خدمت میں صرف کئے تھے۔ ”بلا مت کہہ“ تھے لیکن یہ قیمت بڑے بڑوں سے
بہتر تھی۔ ظاہر ہے ایسی باکمال اور جامع الصفات شخصیت کے غلطی وادبی کارناموں سے بھٹ کرنا
مہر و منصب نہیں اس کا حق واصل دوسرے بزرگوں کو پہنچتا ہے، پھر بھی اگر ان کے بارے میں
مجھے کچھ کہنا ہی ہے، مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ اپنی علمی وادبی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ ایک
اجنبی آدمی بھی تھے، کہتے اچھے، اتنے اچھے کہ اب ایسے لوگ کم ہیں۔ مثال ہی چاہتے ہیں تو یوں
مجھ لیجئے کہ اتنے اچھے جتنے مولانا حالی تھے، آپ کہیں گے کہ مولانا حالی کتنے اچھے تھے؟ کم از کم
اتنے اچھے ضرور تھے جتنے مولوی عبدالحق صاحب ظاہر کر گئے ہیں۔ مولانا حالی کو میں نے نہیں دیکھا
اور میری عمر کے کسی آدمی نے نہیں دیکھا۔ پھر بھی جس نے مولانا قادری کو دیکھا ہے گویا مولانا حالی
کو دیکھا ہے۔ وہی سادگی و شرافت، وہی نیک نفسی و خدا ترسی، وہی خوش خلقی و انکسار، وہی درو
مندی و انسان دوستی، وہی شغف و متی شعور، وہی دل نوازی و خوش مزاجی، وہی اصلاحی نقطہ نظر و
تعمیری طرز فکر، جو حالی کے ہاں ملے گی۔ مولانا میں نظر آتی ہے اسی لئے جب بھی ان سے ملا حالی
کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا اور میں نے حالی کی جگہ حامد پر مد۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں مولانا قادری بھی، مولانا حالی کی طرح، لباس پوشاک، وضع قطع، سوچ بچار اور خیالات و افکار کے لحاظ سے مذہبی آدمی تھے۔ سلسلہ قادریہ سے ریت تھے، اپنے عقائد میں پختہ تھے، ارکان شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ علوم اسلامی، تقوف اور قرآن و حدیث سے انہیں گہری واقفیت و دلچسپی تھی نہ صرف دلچسپی بلکہ فطری لگاؤ تھا پاس ہمہ مولانا میں مذہبی تعصب و خشونت یا مولویانہ مزاج کی شکلی و جگہ فطری نام کو نہ تھی، کہا کرتے تھے کہ مذہب دلوں کو توڑنے کے لئے نہیں دلوں کو جوڑنے کے لئے آیا ہے۔ علم و ادب کے باب میں تو علاقائی تعصبات و طبقاتی مفادات اور مذہبی امتیازات سے یکسر پاک تھے، کسی فن کار کے عقائد اور اطوار و اشغال سے بھی وہ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوتے تھے، صرف اس کے فن کو سامنے رکھ کر اس کے مرتبہ کا تعین کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا کسی تقریر و تحریر سے ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اس سے لطف اندوزی کا پہلو نکال لیتے تھے، ان کی خوش ذوقی اور غرافت پسند طبیعت کا اندازہ اس لطیفہ سے کیجئے جو انہوں نے خود ایک جگہ تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں:

”کسی صحبت میں ایک صاحب نے خواجہ حافظ شیرازی کے اس شعری تشریح فرمائی

گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظ

تو در طریق ادب کوئی دو گناہ من است

فرمایا کہ یہ بندے اور خدا کے درمیان مکالمہ ہے اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے:

بندہ: گناہ گرا (یعنی اے گناہ گر، گناہ کو پیدا کرنے والے،

خدا: چاہا) کیا ہے بندے)

بندہ: نہ بود اختیار (یعنی قہر عصیاں میں گر پڑے تو اس میں کچھ ہمارا

اختیار نہیں)

خدا: ما حافظ (ہم بچانے والے ہیں تو کچھ اندیشہ نہ کر)

مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ یہ سن کر میں لاجول پڑھا ہوا آنکھ کھڑا ہوا کہ دوسرے مصرع

میں خدا جانے کیا گل کھلائیں گے۔ وہ شاید مولانا سب ہوں گے، ہم ہوتے تو

دوسرے مصرع کی شرح بھی ضرور سنتے، غرافت تھی تو دلچسپ اور حماقت تھی تو

عجیب اور اگر ان مولانا کو جیسے سے اٹھانے کی تدبیر تھی تو لا جواب۔“
(نقد و نظر، ص ۴۸)

غرض کہ مولانا بڑے خوش طبع، کشادہ قلب اور وسیع النظر تھے۔ ان کی ادبی تحریروں خصوصاً داستان تاریخ اردو پر نظر ڈالئے، اس میں مولانا نے ہندو مسلمان اور عیسائی ہر مذہب کے بے شمار ادیبوں اور ان کی تصانیف پر اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کیا ہے، آپ کہیں کہیں اس سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ بعض غلط واقعات یا سنین کے اعداد و اراج کی کٹکان دہی کر سکتے ہیں لیکن طرف داری و تعصب یا کسی کی دلا زاری و تنقیص کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے۔

مولانا قادری غالب کے شاگرد نہ تھے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ بہت سی باتوں میں غالب کے شاگرد خاص مولانا حالی سے ملتے جلتے تھے شاید یہ وجہ ہو کہ مولانا حالی اور مولانا حامد دونوں ہم وزن ہیں۔ ان تخلصوں میں عجب مشابہت ہے، بلکہ مشابہت کیوں، علم بدیع کی زبان میں صنعت تہنئیس نکلی ہے اور اس لئے غالب کے باب میں یہ دونوں ہم خیال تھے۔ استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقی اور ان کے شاگرد محمد حسین آزاد کی بدولت، ایک مدت تک جن ناقدر دانوں کا شکار ہوئے اس کا احساس حالی اور مولانا قادری دونوں کو تھا۔ حق یہ ہے کہ اگر مولانا حالی 'یادگار غالب' نہ لکھ جاتے تو شاید "شہرت شعر مکتبی بعد من خواہد شدن" کی تعبیر ابھی کچھ دنوں اور نظر نہ آتی۔ بیسویں صدی کے ادیبوں کو غالب شاعری کا جردمونی ہے اسے حالی کی 'یادگار غالب' کا فیضان خیال کرنا چاہیے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مولانا قادری، غالب سے مولانا حالی ہی جیسی ارادت مندی رکھتے تھے، غالب کا نام کیا آتا گویا جام آجاتا اور ان کے ہاتھ کی سب لکیریں رگ جان بن جاتیں۔ غالب کی طرف سے زمانے کی بے مبری پر اکثر اظہارِ افسوس کرتے اور مرزا کا یہ شعر پڑھتے

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے آئند

کھلا کہ فائدہ غرض بنز میں خاک نہیں

ایک دن باتوں باتوں میں ذکر فرمانے لگے کہ میں ایک زمانے میں غالب پر ایک مضمون انگریزی میں "The licensing Poet" کے عنوان سے لکھنا چاہتا تھا تا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ طبقہ ان کی طرف متوجہ ہو۔ میں نے ان کی اس بات کو اس وقت کچھ زیادہ اہمیت نہ دی

اس لئے کہ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب رسالہ نکلا تو ۱۳-۱۹۱۳ء کے بعض پرستہ میری نظر سے گزرے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ ارادہ مولانا کے تحریری صورت میں ۱۹۱۳ء میں اس وقت ظاہر کیا تھا جبکہ 'یادگار غالب' کے سواہ اردو انگریزی میں کوئی کتاب یا مقالہ وجود میں نہ آیا تھا۔

مولانا کی بعض قدیم تحریروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے کسی زمانے میں غالب کے اردو قاری و یوان سے اشعار بھی انتخاب کئے تھے، معلوم نہیں یہ انتخابات اب بھی محفوظ ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو بڑے کام کے ہیں انھیں منظر عام پر لانا چاہئے اس لئے کہ مولانا نے یہ انتخاب دیوان غالب کے اس نسخے سے کیا تھا جو ۱۸۶۳ء میں غالب کی وفات سے پانچ سال پہلے شائع ہوا اور جس کے پروف بقول مولانا حامد حسن قادری خود غالب نے پڑھے تھے۔ مولانا قادری نے انتخاب دیوان غالب کا انتخاب بھی غالب ہی کے نام کیا تھا۔ یہ انتخاب منظم تھا اور اس بحر و وزن میں تھا جس میں علامہ اقبال نے غالب پر نظم کہی یعنی "ہے پر مرغِ تحفیل کی رسائی جا کیا" منظوم انتخاب اگست ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، چند اشعار اس لکھتے۔

اے لسانِ اہلِ درد اے غالب شیوا یوں	اے کہ ہر ہر مصرع ترا آہِ دلِ غصے دلاں
ایشیائی شاعری کی جان ہے دیوان ترا	تو کبیر ہے ترا قرآن ہے دیوان ترا
تیرا دیوان جذبہ عشاق کی تصویر ہے	مصنوب دردِ نہاں کی پُرِ المِ تفسیر ہے
ہر غزلِ تیری شرابِ درد کا پیمانہ ہے	میکشاںِ عشق کو دیوان ترا سے خانہ ہے
تیرے فہم خانے کا غالبِ جرد کشِ حامد بھی ہے	تیرے پیمانے سخن کا دردِ جنسِ حامد بھی ہے
تیرے دیوان سے لکے ہیں چند اشعار انتخاب	تیری مدحِ پاک سے کرتا ہوں ان کا انتخاب
ایک ہی نظم کہ ستارہ بادشاہتِ صدف	درِ حضورتِ گر قبولِ افتد زہے عز و شرف

غالب شکاری کے سلسلہ میں ان کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ شاہِ دیگر نے دیوانِ غالب کی اشاعت کے خیال سے ایک دیباچہ کا اشتہار دیا اور اس وقت کے سارے ممتاز اہلِ قلم کو دعوتِ فکر دی۔ بعد کے پرستہ دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ مولانا یہ اشتہار دیکھ کر باغِ باغ ہو گئے تھے۔ صرف اس امید پر کہ اس طرح دیوانِ غالب کا ایک خوب صورت انٹیشن دیکھنے کو مل جائے گا، لیکن جب کی میٹھے گزر گئے اور دیوانِ خدّ یا تو مولانا سے نہ ہا گیا اور انھوں نے دیگر کو ایک طویل خط لکھ

بھیجا۔ یہ خط بھی اگست ۱۹۱۳ء کے قفاؤ میں شائع ہوا ہے، اس کی صرف چند سطریں دیکھئے:

”شعر و سخن کی کتابوں میں سے تو دیوان غالب کے سوا کچھ دیکھنے کوئی نہیں چاہتا اور اس کا دیوان ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں خدا جانے اس ”چار جزو“ کی کتاب میں کیا حرا ہے اتنی مرید دیکھا ہے کہ سب دیوان نہیں تو سینکڑوں شعر حفظ ہو گئے ہیں مگر جب دیکھتا ہوں نیا لطف پاتا ہوں۔ آج کل کالج کی لائبریری سے ”یادگار غالب“ لے آیا اس وقت دیکھ رہا تھا دیکھتے دیکھتے وہی خواہش کہ کسی طرح دیوان غالب کا بہترین ایڈیشن شائع ہوا، دل میں پیدا ہوئی، اسی کے ساتھ آپ کا وعدہ اور دیباچہ کا اشتہار یاد آیا۔۔۔ کوئی دیباچہ وصول ہوا یا نہیں۔۔۔ اور اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ خدا کے لئے جلد اشاعت کی صورت کیجئے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا میرا ارادہ دیباچہ لکھنے کا ہے، اگر میں اپنے کو اس قابل سمجھتا تو آپ کے اشتہار و ارادہ سے پہلے لکھ کر شائع کر دیتا کیوں کہ برسوں سے میں اسی تمنا میں ہوں۔ اگر خدا خواست اب تک کوئی عمدہ دیباچہ وصول نہ ہوا ہو تو آپ خود قلم اٹھائیے، اور آپ سے بہتر میں نیاز کو سمجھتا ہوں وہ یہ تکلیف گوارا کر لیں تو بیزار ہے۔“

اس عبارت سے اندازہ کیجئے کہ وہ غالب اور ان کے دیوان کے بارے میں کیا کیا آرزوئیں اور خواہش رکھتے تھے۔ غالب اور کلام غالب سے انھیں کتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ آئے۔ اور بات سے بھی ہوتا ہے، مولانا حامد حسن قادری نے باقاعدہ شاعر بننے کی کوشش کی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ شاعری کا جو ہر فطری لے کرائے تھے، شعر گوئی اور شعر نہی دونوں کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے، شعر گوئی میں ان کی زیادہ توجہ، رباعی، قصیدین اور تاریخ گوئی کی طرف رہی ہے۔ تاریخ گوئی میں انھیں جو کمال حاصل تھا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ رباعی کے سلسلے میں شاید کم لوگوں کو علم ہو کہ ایک زمانے میں ان کی رباعیاں رسالہ ”عالمگیر“ میں مسلسل شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے مولانا ابوسعید ابوالخیر کی فارسی، رباعیوں اور بابا ظاہر مرعیاں کی دو جلدوں کو بھی اردو رباعی میں منتقل کیا تھا۔ مجھے مولانا نے یہ غلطی یا خس پڑھنے کو دی تھی خوبصورت جلد اور سنہرا حاشیہ تھا، اور مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی ابتداء میں ایک منظوم دیباچہ تھا اور وہ بھی رباعیات کی صورت میں۔

رباعی اور تاریخ کوئی کے بعد انھوں نے زیادہ توجہ نکتوں پر صرف کی ہے اور اردو فارسی کے بہت سے اساتذہ کے مصرعوں پر مصرعے لگائے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں صرف ایک مثال سے ان کی جذبہ طبع اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا نے شیخ سعدی کے مشہور رنقتیہ قطع مطلع اعلیٰ بکمالہ پر مصرعے لگائے ہیں اور یہ التزام کیا ہے کہ اردو کے قافیہ، عربی قافیوں کے بالکل مشابہ اور ہم آواز ہوں، غور کیجئے کہ حالہ اور کمالہ کے طرز پر اردو کے قافیہ لانا آسان نہیں لیکن اس منزل سے آسان گزر گئے ہیں، آپ بھی مولانا کے مصرعے سن لیجئے۔

انھیں دل جو کر دیں حوالے ہی	تو کرم پھر ان کا سنبھالے ہی
انھیں جانیں جاننے والے ہی	کہ ہیں وصف ان کے فرالے ہی
تَلَعُ الْفُلُ بِحَمَالِهِ	عَفَفْتُ الدُّعَى بِحَمَالِهِ
عَفَفْتُ حَبِيبُ حَضَالِهِ	صَلُّوا عَلَیْهِ وَآلِهِ

لیکن قصیدین نگاری کے محبوب مشغلے میں بھی ان کی زیادہ توجہ غالب کی طرف رہی ہے اور مولانا نے غالب کی بعض پوری پوری غزلوں کی قصیدین کی ہے، ایک ایک مصرع نہیں بلکہ تین تین مصرعے لگائے ہیں اور غصہ کہا ہے، صرف ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
مولانا فرماتے ہیں:

نام بدنام عشق کا نہ ہوا میں بھی شرمندہ وفا نہ ہوا
یہ برا کیوں ہوا بھلا نہ ہوا درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

غالب کا شعر:

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
مولانا کی قصیدین:

اچھے بے درد بھی نہ بن جاؤ کہ فرض کچھ نہ بھلے سے نہ ہو
ہے یہ آپس کی بات سوچو تو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

غالب کا شعر:

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
مولانا کی تفسیر:

ہم نے کی فکر جب لانے کی اُن کو سوچھی کسی بہانے کی
اب سنی ہے جو گھر لانے کی ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کلام غالب کے سلسلے میں تفسیر کا یہ شوق، مولانا کو شروع ہی سے تھا۔ ایک زمانے میں انھوں نے اس سلسلے میں یہ جذبہ کی تھی کہ غالب کے کسی شعر پر مسلسل غزل کے طور پر متعدد مصرعے یا اشعار لگاتے تھے اور یہ اشعار غالب کے ذمہ تفسیر شعری کمال تخریج و تفسیر بن جاتے تھے، میرے پاس ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء کے نقاد کی دو فائلیں ہیں ان میں مولانا کی دوسری نظموں اور انشائیوں کے ساتھ اس قسم کی متعدد تفسیریں بھی ہیں، بلورضو نہ صرف ایک تفسیر کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ غالب کا شعور شعر ہے

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال ہم اٹھن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
مولانا نے پہلے مصرعے کو ”طرح“ اور محشر کو فائدہ خیال کر کے لکھا ہے کہ:
شاعر ہیں ہم چلیں گے اسی شاہراہ پر لے جائے گا جدھر کو ہمیں رہبر خیال
ہم شیخ ہیں تو حاجت مسجد نہیں ہمیں ہے اپنے ساتھ واسطہ دل منبر خیال
ہم نہت پرست ہیں تو کیوں چائیں دریو پہلو میں اپنے رکھتے ہیں ہم کافر خیال
ہم بوالہوس نہیں ہیں پرستار حسن ہیں معشوق ہے ہمارے لئے دلبر خیال
تم ہو کہ دل نہیں ہے تصور سے آشنا ہم خوگر خیال ہیں ہم بیکر خیال
ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال ہم اٹھن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

(”نقادِ ہست جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۴۶“)

کلام غالب پر مولانا کی یہ تفسیر آج بکھر زیادہ اہم نہ کسی لیکن اب سے پچاس برس پہلے یہ بہت مقبول و پندہ خاطر تھیں اور زیادہ گار غالب و محاسن کلام غالب کے درمیانی عہد میں وہ غالب شناسی اور غالب فنی کا موثر ذریعہ خیال کی جاتی تھیں چنانچہ اسی قسم کی ایک تفسیر پر شاہ مدیر ”نقاد“

نے مئی ۱۹۱۴ء کے پرچم میں حسب ذیل نوٹ شائع کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

”مولوی حامد حسن قادری چھراپوٹی نے مرزا نوشہ غالب کے اشعار لطیف پر تفصیل کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ نہایت بے لطف اور کام کی چیز ہے۔ یہ گویا اصل شعر کی منظوم شرح ہے جس کے ذریعہ اس کے تمام محاسن و مطالب بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور اس دل نشیں طریقہ سے کہ دماغ پر فکر کا بار بالکل نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے دوست نے اسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھا اور کافی اشعار کی تفصیل کر دیں تو وہ ہماری شاعری میں ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہوگا۔“

قادری صاحب مرحوم کی غالب شناسی کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی حیات میں غالب اور غالبیات پر جو کچھ لکھا گیا تھا سب ان کی نظر سے گزرا تھا، کلام غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں سب کا انھوں نے غائے مطالعہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ شوکت تھانوی کی مزاحیہ شرح دیوان غالب کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا اور ہر شرح کے عیوب و محاسن پر مفصل بحثیں کی ہیں۔ یہ بحثیں مضامین کی صورت میں ان کی تصنیف نقد و نظر میں محفوظ ہیں، اور غالب کے متعلق ان غلط فہمیوں اور غلط اندیشیوں کا ازالہ کرتی ہیں جو مختلف شارحین نے پیدا کر دی ہیں، انھوں نے مولانا نے، غالب پر اتنا کچھ نہ لکھا جتنا وہ انھیں جانتے تھے، ہاں جو کچھ ان پر لکھا جاتا تھا برابر اس کے دیکھنے کی فکر میں رہتے تھے اور جہاں کسی سے کوئی چوک ہوتی جب تک اس کی تصحیح نہ کر دیتے ان کی طبیعت کو چین نہ آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالبیات کے سلسلے میں ان کی یہ تحریریں جو کہ ہر قدم پر رہنمائی کا کام کرتی ہیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی اس غالب شناسی یا غالب دوستی ہے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ غالب کے طرفدار تھے۔ ایسا نہیں ہے سخن پہلے تھے، طرفدار بعد کو، انھوں نے کلام غالب پر کڑی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بعض مضامین میں ان کی کمزوریاں ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ زبان و معنی اور عروض و بیان ہر قسم کے عیوب انھوں نے غالب کے یہاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور اس کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ”میں اس کو قدیم غزل کا مجذوبہ اور جدید غزل کا محسن مانتا ہوں، غالب نے اپنے دیوان فارسی کو ”دین سخن“ کی ایزدی کتاب کہا ہے میں اس قول کو اردو دیوان کے حق میں بھی درست سمجھتا ہوں۔“

دیوانِ غالب - نسخۂ خواجہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمن

غالب نے جب اپنے بارے میں اس طرح کی باتیں کہی تھیں کہ
بیا آؤ دیکھ گرائیں جا بود زبان دانے
غریب ہر سخن ہائے گفتنی دارد

ہوں گری نشاطِ شعل سے فخرِ سنج
میں منقلب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

یا
مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد و فلک ما

تو بہتوں نے غالب کے اس نوع کے بیانات کو غلو اور تعقی محض سے تعبیر کیا تاہم آغزا غریب کو تسلیم کرنا پڑا کہ غالب کے اوجات و بیانات، کسی سبقت شاعرانہ یا تقاضے جا پر نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہیں۔ طرفدارانِ غالب سے لے کر حریفانِ غالب تک سب نے اپنی تحریروں سے اس بات کی شہادت دی کہ غالب فی الواقع ایک بلند فہم ہے اور اردو شاعری میں بعض کے نزدیک اس سے بڑے اور برتر شاعر تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کا مثیل و نظیر کوئی نہیں ہے غالب کی اس حیثیت کو حوالے میں دس میں برس نہیں کم و بیش ڈیڑھ سو سال بیت گئے۔ غالب نے اپنے پر اہل و ہر کا قیاس کر کے فہم شاعری کے بارے میں یہ حکم تو لگا دیا کہ

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ چٹا نہ ہوا

لیکن جس طرح وہ قطرے میں دجلہ دیکھ رہے تھے اور جزو میں کل کا مشاہدہ کر رہے تھے، اسے اوروں کو دکھانا اور مشاہدہ کرانا بہت مشکل ہو گیا۔ اس کے لیے پہلے خود انھیں اپنے بعض اشعار و تمیحات کی تخریج و توضیح کرنی پڑی اور لفظ و معنی کے بیچ درج اور تہ بہ تہ روشنیوں کو بھٹکانا پڑا، پھر اللہ نے ان کے ارادت مند و شریف شخص، شاعر و ناقد مولانا الطاف حسین حالی کو وہ توفیق بخشی کہ انھوں نے ”یادگار غالب“ کے ذریعے، اچھے ہم عصر نامور سخن شناس، دانشماء پر دان محمد حسین آزاد کی ان جملہ زیادتوں کا حساب چکارا یا جو موصوف نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کو آ کے بڑھانے کے لیے غالب کے ساتھ کی تھیں۔

اس طرح غالب کی قدر شناسی کا راستہ ہمیشہ کے لیے صاف و بصور ہو گیا۔ افکار تازہ سے آراستہ اور علوم جدیدہ سے مسلح غالب شناسوں کا ایک پورا قافلہ تیزی سے اس راہ پر چل نکلا اور بیسویں صدی تو پوری صدی غالب کے فکر و فن کی تحقیق و تنقید کے لیے وقف ہو گئی۔ پہلے مطلق انوار الحق، ڈاکٹر عبدالرحمن، بخٹوری، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، مولانا امتیاز علی خاں عریضی، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، مالک رام اور ڈاکٹر فخر احمد جیسے بزرگوں نے اس طرف توجہ کی پھر ڈاکٹر فاضل احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، کالی داس گپتا رضا، مشفق خولاب، آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سید معین الرحمن جیسے قدرے جوان سال اہل فکر و نظر سامنے آ گئے اور ان سب کی کوششوں کے نتیجے میں یہ ہوا کہ غالب کا نام جو اس سے پہلے صرف خاص خاص حد تک محدود تھا حلقہ خاص سے نکل کر حلقہ عام کے بازو ذوق لوگوں تک پہنچ گیا۔

غالب جنسی و غالب آشنائی کی اس توسیع میں جیسا کہ عرض کیا گیا ایک دو نہیں درجنوں بالغ نظر اہل قلم نے حصہ لیا لیکن مجھے کہنے کی اجازت دیجئے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تاثر نہیں ہے کہ رواں صدی کی آخری تین دہائیوں یعنی گزشتہ تیس برسوں میں جس توازن و تسلسل، جس انہماک و انفریق جس مستقل حراچی و خرد جمعی، جس مطالعاتی وسعت و تنقیدی بصیرت اور حسن خیال و عمل کے ساتھ، ڈاکٹر سید معین الرحمن نے کام کیا ہے ان کے کسی دوسرے ہم عصر نے نہیں کیا جہر چند کہ غالب اور غالبیات کے تعلق سے ان کی مطبوعات کی تعداد خاص ہو چکی ہے۔ پھر بھی ان کے کام کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی چنانچہ اگر صرف ان کے مطبوعہ کام ہی کو نظر میں رکھیں تو کہنا پڑے گا

کہ غالب اور کلام غالب کی تحقیق و تنقید اور ترجمہ و تفسیر کے باب میں نہ صرف یہ کہ ان کا کام پہ لحاظ مقدر اور قہدار دوسروں سے زیادہ ہے بلکہ نقد و نظر کے حقد اول میزان و معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔

غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر سید معین الرحمن کا پہلا قاطعی قیود کا نام "اشاریہ غالب" ہے۔ یہ کام پہلی بار ۱۹۶۹ء میں بصورت کتاب، منظر عام پر آیا اور غالب کے بارے میں اپنی نوعیت کا پہلا قاطعی قدر کا کام ہونے کے سبب سارے علمی و ادبی حلقوں میں سراپا گیا۔ "اشاریہ غالب" کے سامنے آنے سے یہ ہوا کہ ۱۹۷۰ء تک غالب کے کلام و نثر کے جتنے مجموعے اور ان مجموعوں کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے تھے، وہ سب کے سب بہ یک وقت سامنے آ گئے اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے ادب کے قارئین یا آسانی ایک ایسے خزینہ میں بہا سے حصارف ہو گئے جو "اشاریہ غالب" کے سوا کسی اور طرح ممکن نہ تھا، اس سے ایک طرف تو یہ ہوا کہ ادب کے عام قاری کو غالب اور غالبیات کے باخذا تک رسائی حاصل ہو گئی، معلومات میں خوش آئند اضافہ ہوا، افادے کی آسان صورت نکل آئی، ذہن میں کلباتے ہوئے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی راہ ہموار ہو گئی اور غالب و غالبیات پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں میں ایک نئی لگن نئی جستجو، نیا ذوق و شوق اور تازہ دلول و حوصلہ پیدا ہوا۔ نیز اس خوف و خیال سے کہ غالبیات سے متعلق ساری اہم اطلاعات "اشاریہ غالب" کے ذریعے سب کے سامنے موجود ہیں، ان میں تحقیقی و تنقیدی کاموں کی فیصلہ سازی میں مزید احتیاط، توجہ، جانچ پڑتال اور پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھانے کی عادت رائج ہوئی۔ گویا معین الرحمن نے "اشاریہ غالب" کے ذریعے غالب کے طرف داروں اور غالب کے سخن فہموں دونوں کے لیے تحقیق و تنقید کی ایک ایک نئی راہ کھول دی، ایسی راہ جس کے بغیر غلط روی اور گرم رہی کا خطرہ بہر حال لاحق رہتا تھا۔

ایک "اشاریہ غالب" پر کیا موقوف ہے غالب سے متعلق معین الرحمن کی متعدد مطبوعات میں سے کئی ایسی ہیں جو تحقیق و تنقید، دونوں راہوں سے مطالعہ غالب کے سلسلے میں ناگزیر باخذا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس جگہ ان کا مختصر سے مختصر ذکر بھی ممکن نہیں، البتہ "غالب اور انقلاب ستون" نامی کتاب کا چند سطری ذکر بہر حال کروں گا۔ یہ کتاب صرف کئی فیصں کے ۱۹۷۴ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے داؤد دلائی انعام کی مستحق قرار پائی بلکہ اس نے معین الرحمن کے نام اور کام کو غالبیات کے سلسلے میں مستغنا معتبر و مستحکم کر دیا۔ اس کتاب کے مندرجات کے سامنے آنے سے قبل تک غالب کے بعض ناقدین سخت گرمی و غلط فہمی کا شکار تھے چنانچہ جہاں جہاں غالب کے اشعار میں

علم و ستم، رنج و غم، زمانے کی ستم شکاری، وقت کی ناچاری، ناواری و بے روزگاری اور عسرت و بے سروسامانی کا ذکر ہوتا تھا، ہمارے بعض ناقدین ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ آرائی و تہذیب کاری سے مشکک کر کے غالب کے ذہن پر ہنگامہ خد کے اثرات کا نتیجہ ثابت کر دیتے تھے۔ معین الرحمن نے اس غلط فہمی کو صحیح بنی کو اپنی کتاب میں معقول دلائل و شواہد سے رد کیا اور یہ انکشاف کیا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زیر اثر غالب کا ذہن اتنا بچھ گیا تھا کہ انھوں نے خد کے بعد سے لے کر اپنی وفات ۱۸۶۹ء تک کی درمیانی مدت میں تقریباً شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ ان کے کلام کی توقیت بتاتی ہے کہ اس دس بارہ سال کے عرصے میں انھوں نے کم سے کم اشعار کہے اور شعر گوئی کے بدلے خطوط نویسی کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ ظاہر ہے اس انکشاف تازہ نے طلحہ وادلی حلقوں کو چونکا دیا، اپنی طرف متوجہ کیا، محققین و ناقدین غالب کو غور و فکر کے لیے ایک نیا موڑ دیا اور غالب کے حالات و کلام کو نئے رخ سے دیکھنے دکھانے پر مجبور کیا۔

غالب کے سلسلے میں اس طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب مصوف کی تحقیقی کاوشوں کی بدولت پہلی بار سامنے آئی ہیں چنانچہ اگر غالب کے سلسلے کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے معین الرحمن کی الاولیات گنوا لی جائیں تو ان کی تعداد اور جنوں تک پہنچے گی۔ سب سے نمایاں اور اہم بات تو اس سلسلے میں یہی ہے کہ معین الرحمن پہلے پاکستانی ادیب ہیں جنھوں نے غالب جیسے تابعدار روزگار اور بحر زغار کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا اور بی ایچ ڈی کی سند لی اور بی ایچ ڈی کے بعد بھی غالب ہی کے تعلق سے انھوں نے اتنا وافر و قیام کام کیا اور ایسی بلند سطح سے کیا کہ انھیں کسی جامد سے ڈیٹ کی رکی سند دی جائے یا نہ دی جائے، لیکن میں جانتا ہوں اور چرمی دیانت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت اردو کے چند گنے چنے معتبر غالب شناسوں کی صف میں شامل ہیں اور انھوں نے جو کام کیا ہے وہ بی ایچ ڈی اور ڈیٹ کی اسناد و منازل سے بہت آگے کی چیز ہے۔

بلسلسلہ غالب، معین الرحمن کے امتیازات میں اس بات کو بھی شامل کرنا چاہیے کہ عصر حاضر کے غالب شناسوں میں یا غالب کے قابل ذکر ناقدوں اور محققوں میں وہ سب سے کم عمر ہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ غالب کے باب میں آج بھی ان کا قلم ان سے بھی زیادہ توانا ہے اور غالب و کلام غالب کو مسلسل اپنی جولاں گاہ دینے ہوئے ہے۔ اس جولانی کی تازہ ترین مثال ”دیوانہ غالب“ کا وہ نادر و نایاب خطی نسخہ ہے جو ”نسخہ خوبہ“ سے موسوم ہو کر مکتبہ الحجاز، من آباد

لاہور سے ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا ہے اور اس اہتمام و التزام کے ساتھ آیا ہے کہ غالب کے طرفداروں اور غرورہ گیروں، دونوں کو جبریت زدہ کر دیا ہے۔

آج سے کوئی پچیس سال پہلے کی بات ہے ”غالب اور انقلاب ستاون“ پر اعلیٰ درجہ خیال کرتے ہوئے میں نے ”نگار“ بابت جنوری، فروری ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا کہ ”غالب اور غالبیات“ پر ایک دو مہینے تک لوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ لکھنے والے جھٹکتے ہیں نہ چڑھنے والے سیر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غالب کا ہر بالغ نظر نقاد، اس کی شخصیت اور کلام سے کوئی نہ کوئی ایسا اچھوتا پہلو، اپنی گفتگو کے لیے نکال لیتا ہے کہ وہ ملم، ادب کے قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ کم از کم زیرِ نظر کتاب کی یہی صورت ہے۔ اس میں مصین الرحمن نے غالب کی زندگی اور فکر و فن کے بارے میں بعض ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جو ابھی تک غالب کے عام قاری ہی سے نہیں خاص سے بھی پوشیدہ تھیں۔

میرا یہ بیان من و عن ذاکثر مصین الرحمن کی تازہ ترین کتاب ”دیوان غالب نسخہ خوب“ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ یہ نسخہ ادب کے قارئین کے لیے عموماً اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے خصوصاً ذاکثر مصین الرحمن کی طرف سے اسی نوع کا قیمتی تحفہ ہے، جس نوع کا تحفہ مفتی انوار الحق نے تقریباً آج سے اسی سال پہلے بھوپال میں دستیاب ”دیوان غالب“ کے خطی نسخے، نسخہ حمید یہ“ کے نام سے پیش کیا تھا اور جس کی اشاعت نے علمی و ادبی حلقوں میں ایک پھل پھلائی تھی۔

”نسخہ خوب“ بھی خطی ہے اگرچہ خطِ غالب نہیں ہے لیکن اس کی افادیت و اہمیت ”نسخہ حمید یہ“ سے کم نہیں ہے اس لیے کہ ”نسخہ خوب خطی“ کم و بیش غالب کا وہی دیوان متداول ہے جو پہلی بار ۱۸۴۱ء میں اور بعد ازاں متعدد بار غالب کی زندگی میں شائع ہوا اور خود غالب نے اسے مصدق و مستند ظہر یا حضرت کے بقول ”زیرِ نظر تادیر نسخہ خوب کی ایک بڑی جدا امتیاز یہ ہے کہ کتابت کے بعد یہ نسخہ غالب کے پاس اور ان کے پیشِ نظر رہا اور اسے انہوں نے شروع سے آخر تک دیکھ کر جہاں جہاں اپنے قلم سے صحیح یا اضافہ کیا ہے“ اس اعتبار سے دیوان غالب نسخہ خوب خطی مرتبہ ذاکثر سید مصین الرحمن، اُن سارے خطی نسخوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ معتبر و قابلِ استناد ہے جو اس سے پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود اور ذاکثر سید عبداللہ کے تعارفات کے ساتھ متعارف ہوئے ہیں۔

”نسیخہ خوبہ خٹکی“ جو ۱۹۸۱ء میں ایک پرانی کتابوں کی حشمتی دکان سے معین الرحمن کے ہاتھ لگا اور جسے انھوں نے انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر اور غالب کے قدر رواں مشہور اردو ادیب، خوبہ منظور حسین سے اپنی عقیدت خاص کی بنا پر ”نسیخہ خوبہ“ کا نام دیا ہے، ۱۸۵۲ء کا مکتوب ہے اور اس اعتبار سے نہایت اہم و منفرد ہے کہ یہ ۱۸۴۷ء تا اگست ۱۸۵۲ء کے درمیان کہے گئے اشعار غالب کی تائید و تصدیق کرتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غالب نے ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیان چھ برسوں میں صرف چار سو اکتیس اشعار کہے ہیں اور ان اشعار میں غزل، قصیدہ، قطعہ اور رباعی، چاروں اصناف کے شعر شامل ہیں۔ تحقیق کا کام کرنے والے اہل قلم خوب جانتے ہیں کہ کسی قدیم شاعر کے دو چار شعروں کے بارے میں بھی یہ سراغ لگانا کہ وہ کس سنہ میں یا کس زمانے میں کہے گئے ہیں کیسا مشکل کام ہے، نہ کہ غالب جیسے عظیم و قدیم شاعر جس کے کلام کے خٹکی و مطبوعہ نسخے درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، اس کے بارے میں وثوق سے یہ نشان دہی کرنا کہ زیر بحث چار سو اکتیس اشعار غالب نے کب اور کن زمین کے درمیان کہے ہیں حدود وچ مشکل کام ہے۔ دلو کے مستحق ہیں ڈاکٹر معین الرحمن کہ وہ اپنی انتخاب محنت اور غیر معمولی توفیق تحقیق کی بدولت اس مشکل سے آسان گزر گئے ہیں۔

”دیوان غالب نسیخہ خوبہ“ مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمن کی ایک عطا اردو والوں کے لیے یہ بھی ہے کہ غالب کے متداول دیوان کا جو ”دیباچہ“ اور ”خاتمہ“ پہلی اشاعت سے لے کر آج تک بڑا بن فاری چلا آ رہا تھا اور جن کا سمجھنا ہمارے لیے آسان نہ تھا، ان کا اردو ترجمہ بھی زیر نظر ”نسیخہ خوبہ“ میں شامل ہے۔ بڑی تطہیر کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اپنی اصل خطاطی سمیت پوری احتیاط و التزام اور اہتمام محنت و صفائی کے ساتھ ویزیت مشین شہید کاغذ پر دیکھ دیکھ جلد اور ٹیکس طباعت کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے اور غالب کے دوسرے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر شاعری روح کے لیے اردو والوں کی طرف سے خراج عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اور کچھ نہیں تو ہمیں اس عظیم کام پر کم از کم معین الرحمن صاحب کو بد یہ تبریک پیش کرنا چاہیے۔

”خٹے بیاو غالب“ از اطہر رضوی

سنہ ۱۹۹۵ء

غالب، اردو کا ایک عجیب و غریب شاعر ہے، عجیب و غریب ان معنوں میں کہ نہ تو اس پر سوچنے والے جھکتے ہیں نہ لکھنے والے، نہ اس کے پڑھنے والوں میں جوئی کی واقعہ ہوتی ہے اور نہ اس کے کلام پر سر ڈھٹنے والوں میں بلکہ سلسلہ اس کے برعکس ہے، ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس کو ذہن و دل سے قریب تر رکھنے کے لئے نئی نئی راہیں نکالی جا رہی ہیں جن میں تازہ ترین وہ راہ ہے جو کنیڈا میں مقیم جناب اطہر رضوی کی ایجاد ہے۔

اطہر رضوی صاحب شاعر ہیں، نثر نگار ہیں اور اردو انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ جتنا اچھا لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا بولتے ہیں۔ خوش فکر ہیں، خوش نظر ہیں خوش وقت اور خوش باش ہیں، خوش لباس و خوش مزاج ہیں اور زندگی کی طرح زیست کرنے کو عبادت جانتے ہیں۔ چنانچہ غالب کے اس نوع کے اشعار کے اجراع میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

بختے ہے جلوہ گل، ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

وہ زندگی ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ طلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

یہ غالب کے اقوال ہیں اور غالب کا خود اپنے اقوال پر، عاملِ نظر آنا ضروری نہیں لیکن غالب کے سچے عاشق جناب الطہر رضوی ان اقوال کے پابند و عاملِ نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کے سارے مناظر سے آنکھ لڑاتے اور ان سے لطفِ اندوز ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور صرف اپنے ہم عمر و ہم خدائقِ خواتین و حضرات کی مجلس میں نہیں بلکہ اپنے سے چھوٹوں اور نوجوانوں کی محفلوں میں بھی لطفِ اندوزی اور گلِ افشانی کی سبیل نکال لیتے ہیں۔ زندگی کو عزم و حوصلے کے ساتھ جیتے مسکراتے اور روشناسِ طاق ہو کر بسر کرنے کو حاصلِ حیات جانتے ہیں۔ خلوتِ نشینی و خود پوشی پر بزمِ آرائی و نہرِ آزما کی کوثرِ چید دیتے ہیں۔ ناکامیوں سے افسردہ خاطر ہونے کے بجائے، انھیں حصولِ کامرانی کا وسیلہ بنا لیتے ہیں اور ہر لمحہ نئے طور و نئی برقِ تجلی کے شوق سے خود کو مرشارد رکھتے ہیں۔ جینے کے اس فریے کا فیضان ہے کہ عمر رسیدگی کے باوصف ان کے جسم و جان پر کھولت و انحصال کے آثارِ نظر نہیں آتے۔ ان کی یہ حوصلہ مندی، تازہ دلی، بھجھجھوں کے لئے قابلِ رشک ہے۔

شعروادب کے حوالے سے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ ایک باشعور، باصلاحیت ادبی ہیں۔ فطرت نے انھیں شعرِ گفتن و شعرِ منہی کی صلاحیتوں سے بھی پوری طرح نوازا ہے، لیکن ان کی ادبی صلاحیت یا شوقِ سخن وری کی جولوہِ ان کے جسم و جان کو محیط کئے ہوئے ہے، وہ اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنی تہذیب اور اپنی ملتی و ملکی اقدار سے ان کا بے پناہ لگاؤ ہے۔ یہ اس لگاؤ ہی کا ایک رخ ہے کہ وہ ایک مدت سے کنیڈا میں اردو شاعری کی شمعِ روشن کئے ہوئے ہیں، پھر چونکہ اس شمع کو انھوں نے اردو کھائیکے عظیم مفکرِ شاعر، غالب سے وابستہ کر رکھا ہے اس لئے اس کی لہر و زبرد زبوحی جارہی ہے اور کنیڈا کا ایوانِ اردو، روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا ہے۔

اس ایوان کو مستحضرِ روشن رکھنے کے لئے ان کی اختراعِ پسندِ طبیعت نے شعروادب کے بہت سے پہلو نکال رکھے ہیں، ان میں دو پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جو سالانہ مذاکرے یا سیمینار کی صورت میں کسی خاص شخصیت یا موضوع کے حوالے سے برپا کیا جاتا ہے جس میں پاک و ہند کے ممتاز شاعر و ادیب شرکت کر کے اس کی گونج کو صرف مقامی نہیں رہنے دیتے بلکہ دور و دور تک پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرا ہم پہلو یہ ہے کہ وہ غالب و کلامِ غالب کی تفہیم و تبلیغ

کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ وقتے وقتے سے طرعی مشاعرے منعقد کرتے ہیں اور غالب کے مصرعوں کو طرعی مصرع قرار دے کر شعراء کو ان پر غزل کہنے کی ترغیب دیتے ہیں اور پھر ان طرعی غزلوں کو یکجا کتابی صورت میں شائع کر کے اردو اور غالب دونوں کے پرچم و بار غیر میں بلند رکھتے ہیں۔

بعض حضرات آج کل طرعی مشاعروں کو بے وقت کی راگنی خیال کرتے ہیں ان کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اردو شاعری اور غالب کے حوالے سے اطہر رضوی کے ہاں کردہ طرعی مشاعرے کی روایت کے کئی بہت اہم پہلو ہیں۔ طرعی غزلوں کی یہ روایت صرف نوآموز شعراء کو نہیں بلکہ پختہ مزاج شعراء کو بھی بہت کچھ دیتی ہے۔ غزل کہنے کے لئے جو مصرع دیا جاتا ہے شاعر کو اس کی معنوی تہ داروں پر بار بار غور کرنا پڑتا ہے، اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو اپنے قلب و ذہن میں اتارنا پڑتا ہے، ساتھ ہی اصول قافیہ و وزن کے ارکان اور بحر و مین، سب کو توجہ کا مرکز بنانا پڑتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ ہر شاعر اپنے آپ کو شعر گوئی، فن شعر گوئی اور زبان و بیان کے رموز و نکات سے حیرن کر لیتا ہے۔ طرعی مشاعروں کی یہی وہ افادیت ہے جس سے استفادے کی راہیں جناب اطہر رضوی نے ایک مدت سے کھول رکھی ہیں۔

یہ تو ان مشاعروں کی عمومی افادیت کی بات تھی، ان کا خصوصی رخ یہ ہے کہ یہ طرعی مشاعرے غالب اور کلام غالب کو متعارف کرانے، انھیں دوسروں تک پہنچانے، ان کے انقی و عموومی محاسن شعری کو اُپاگر کرنے اور قاری و شاعر کو غالب سے قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ طرح پر غزل کہنے والا جب غالب کی غزل کو سامنے رکھ کر غزل کہے گا تو وہ یقیناً غالب کے صرف مصرعے پر نہیں بلکہ پوری متعلقہ غزل پر ایک نظر ڈالے گا، غالب کے انداز فکر اور اسلوب بیان پر غور کرے گا اور اپنی قوت تخیل کو غالب کا ہم سفر بنانے کی جتنی الوسعی کوشش کرے گا اور ایسا کرنے میں صرف یہی نہیں کہ اس کے ذہن میں جلا پیدا ہوگی بلکہ وہ شعر گوئی کی ارتقائی منزلوں کو بڑی آسانی سے طے کر سکے گا۔ اب اس خاص زاویے سے دیکھئے تو غالب کے مصرعے طرح کے حوالے سے اطہر رضوی کے ہاں کردہ مشاعرے نہ صرف غالب اور کلام غالب کی اشاعت و تنظیم میں معاون نظر آئیں گے بلکہ ہمارے شعراء ان کے وسیلے سے اتنا کچھ حاصل کر لیں گے کہ درجنوں کتابوں سے بھی وہ میسر نہیں آئے گا۔

اطہر رضوی صاحب نے غالب کے سلسلے میں طرحی مشاعروں کی معرفت جس انداز سے کام کرنے کا آغاز کیا ہے، اسے بعض حضرات نے سن ۱۹۲۹ء میں غالب کے جشن صد سال کے موقع پر اپنانے کی کوشش کی تھی۔ غالب کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی گئی تھیں۔ تفصیلات کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی تھیں اور غالب کے مصرعے کو طرح قرار دے کر شعری نشستیں بھی منعقد کی گئی تھیں، لیکن یہ سارا کام انفرادی نوعیت کا تھا ظاہر ہے اس کا حلقہ اثر محدود تھا۔ اس کے برعکس اطہر رضوی صاحب نے ”بیاد غالب“ کے زیر عنوان جس نوع کی طرحی غزلیں یکجا کی ہیں اور طرحی مشاعرے برپا کئے ہیں وہ اجتماعی نوعیت کا کام ہے اور ملائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتیجتاً اس کا حلقہ اثر بھی بہت بڑا ہے۔ چنانچہ غالب کے نام اور کام کو دور دور تک پہنچانے، عام و خاص کو اس کی جانب توجہ دلانے اور غالب کی مقبولیت کے گراف کو بلند تر کرنے میں اس اجتماعی کام کی نوعیت و افادیت شخص یا دوسری انفرادی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ کار کشاؤ کا رگر ہے۔

”بیاد غالب“ مرتبہ اطہر رضوی میں ہیں سے زیادہ شاعروں کی غزلیں شامل ہیں اور ایک آدھ کو چھوڑ کر بھی کنیڈا میں آباد ہیں۔ اس میں جو طرحی غزلیں شامل ہیں ان میں چار زمینیں ردیف ”الف“ کی ہیں، چار زمینیں ”نون“ کی ہیں اور سات ردیفیں حرف ”ی“ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ”الف“ ردیف کی زمینوں کے مصرعہ طرح اس طود پر ہیں:

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

نہ ہو مرنا تو بھینے کا مزہ کیا

ہاں آس زود پشیاں کا پشیاں ہوتا

مصرعہ اول پر صرف نو شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے، ان میں جوش مند وز کی کی غزل سب سے طویل یعنی سولہ سطرہ اشعار کی ہے۔ بقیہ غزلیں پانچ اور نو اشعار کے درمیان ہیں۔ اپنے اپنے زور

جان اور پروا تخیل کو بھی نے آزمایا ہے لیکن عروج اختر زیدی کی غزل حاصل مشاعرہ کہی جاسکتی ہے۔ نو شعروں کی یہ غزل پوری کی پوری مرصع اور دھن دل ہی کھد کے صداق ہے۔ اطہر رضوی اور اشفاق حسین کے یہ شعر بھی قابل توجہ ہیں

ہم جو ہیں فردا سے قوت آزا
زخمِ امروز سے گھبرائیں کیا
اطہر رضوی

ہر کھلی کوپے میں سورج قید ہے
آنکھ والے اس نگر میں جائیں کیا
اشفاق حسین

”الف“ کی دوسری زمین کی غزلیں پہلی زمین کے مقابلے میں کمزور ہیں البتہ محترمہ عقیلہ شاہین کا یہ شعر بہت اچھا اور سچا ہے کہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مسئلے ان کے کچھ نہیں ہوتے
جن کو غیرت کا مسئلہ نہ ہوا
روایف ”الف“ کے قیصرے سلسلے کی غزلیں پہلی دو کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہیں۔ بطور نمونہ پہلے اطہر رضوی کے دو مثنوی انداز کے دو شعر دیکھئے:

کنول اب آرزو کے کیا کھلیں گے
سحر ہونے میں باقی ہی رہا کیا

مسلل میری جانب دیکھتی ہیں
انھیں اس عمر میں یہ ہو گیا کیا
دوسروں کے یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں جو صورت و معنی دونوں اعتبار سے قابلِ داد ہیں:

مرے آذر سمجھتا کیوں نہیں ہے
کہیں پتھر کا ہوتا ہے خدا کیا
سلیم آذر

مزاج شیر سے سب کو گلہ ہے
کوئی ہو آشنا نا آشنا کیا
اختر آصف

جو اپنا فرض تھا ہم نے نبھایا
ہر کار خیر ہمیں صلہ کیا
پندے ہیں انہیں اڑنا تھا آخر
پندوں کو درختوں کا گلہ کیا
سلیم الہی زلفی

دریچے گھر کے کر کے بند عابد
ہوا کا روک لو گے راستہ کیا
عابد جعفری

میں خود اپنا مخالف ہو گیا ہوں
بگاڑے گا کوئی منہ کا مزہ کیا
عابد جعفری

اگر مقصد نہ ہو جینے کا مسلم
تو ایسی زندگی کا فائدہ کیا
مسلم چشتی

ردیف "الف" کی چوتھی زمین جس کا مصرعہ طرح تھا "ہائے اُس ڈور پشیاں کا پشیاں
ہوتا" اس پر صرف نو شاعروں نے توجہ دی ہے اور ہر ایک نے ایک دو شعرا جیسے نکال لئے ہیں لیکن
ڈاکٹر خالد سبیل کی پوری غزل اوروں سے بہتر ہے صرف ابتدائی دو شعر سن لیجئے:

روز روشن میں بھی لوگوں کا ہراساں ہوتا
شام ڈھل جائے تو ماؤں کا پریشاں ہوتا
خوف چپکے سے گلی کو چوں میں گھس آیا ہے
ہم نے دیکھا ہے گھرے شہروں کا دیراں ہوتا

روایف ”نون“ کی چار زمینوں کے طرزی مصرعے یہ تھے:

تماشا ئے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آجی نہ سکوں

ہم کو تسلیم کو نامی فرماؤ نہیں

پہلا مصرعہ غالب کی نہایت گلگلت غزل کا ہے اور اس میں انھوں نے ”کم“ اور ”ہم“ کے

قافیے میں دو ایسے غضب کے شعر نکال لئے ہیں کہ ان قافیوں کو ہاتھ لگانا آسان نہیں تھا پھر بھی

داغ و بلوی نے دونوں قافیے اپنائے ہیں اور خالص غزل کے بہت خوبصورت اشعار نکالے ہیں۔

پہلے غالب کے شعر دیکھئے:

ترے سرِ قامت سے اک قدِ آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے مجھ آئینہ داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اب داغ کے اشعار کا اظہار اٹھائیے اور قافیوں کے خوبصورت مصرع کی داد دیجئے:

قیمت ہے چشمِ تھافل بھی اُن کی

بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

ادھر شرمِ حائل، ادھر خوفِ مانع

نہ وہ دیکھتے ہیں، نہ ہم دیکھتے ہیں

”یہاں غالب“ ”مرتبہ طہر رضوی“ میں بھی ان قافیوں کو برتا گیا ہے لیکن کسی کو کوئی خاص کامیابی

نہیں ہوئی، پھر بھی ”کم“ کے قافیے کے بعض اشعار دیکھتے چلے کہ بہر حال داد کے قابل ہیں۔

ستاروں کی جا کر خبر لانے والے

زمین کے مسائل کو کم دیکھتے ہیں

اسماء واری

عجب ان دنوں رنگ ہم دیکھتے ہیں
زمین اپنے محور پہ کم دیکھتے ہیں
اشفاق حسین

رہ عشق کے بچ و خم دیکھتے ہیں
ہر اندیشہ بیش و کم دیکھتے ہیں
عروج اختر زیدی

حسین کون ہے وہ صنم دیکھتے ہیں
تراشا ہے کس نے یہ کم دیکھتے ہیں
سلیم آذر
غالب کے دوسرے قافیوں کا کوئی قافلہ ذکر مصروف "بیاد غالب" میں نظر نہیں آیا البتہ یہ کیا
کہ ہے کہ غالب کی زمین کو ہاتھ لگایا گیا اور غزل کہی گئی۔

"نون" کی زمین کا دوسرا مصروف طرح یہ تھا "ساقی نے کچھ ملا دیا ہو شراب میں" اس
غزل میں غالب نے "جواب" کا قافیہ پس لکھ کر دیا ہے:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں چانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالب کی اس زمین میں متعدد اساتذہ کی غزلیں ہیں اور انھوں نے بھی "جواب" کے قافیہ پر طبع
آزما کی ہے بطور مثال وہ تین شعر دیکھئے:

یاں لب پہ لاکھ لاکھ خن اضطراب میں
وہاں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں
ذوق

کہتے ہو ہم کو ہوئی نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
مومن

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
اپنی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں
دائع

بے قصد لکھ دیا ہے گلہ اضطراب میں
دیکھوں کہ کیا وہ لکھتے ہیں خط کے جواب میں
امیرینائی
حیرت کی بات یہ ہے کہ ”بیاد غالب“ کے کسی شاعر نے اس قافیے کو ہاتھ نہیں لگایا اگرچہ
سامنے کا قافیہ تھا، دوسرے قافیوں میں البتہ بعض اچھے اشعار نکال لئے ہیں صرف اشفاق حسین اور
عروج اختر زیدی کے دو شعر دیکھئے:

میں حرف حرف ہوں تری دل کی کتاب میں
مجھ کو بھی پڑھ کر میں بھی ہوں شامل نصاب میں
پھر دیکھ کیسے بختی ہے تاروں کی انجمن
تو خواب ہی کی طرح سہی آ تو خواب میں
اشفاق حسین

روحیں لبو لبو تو بدن ہیں عتاب میں
ہے جتنا یہ ملک مرا کس عذاب میں
مہو خزاں نے دیکھے نہ ہوں گے جو خواب میں
ہم نے وہ دکھ اٹھائے ہیں فصلی گلاب میں
عروج اختر زیدی
رویف ”نون“ کا قیصر مصرعہ طرح تھا ”میں گیا وقت نہیں ہوں کہ بھڑ آ بھی نہ سکوں“
غالب کا پورا شعر اس طور پر ہے اور ضرب النثل بن چکا ہے:

مہراں ہو کے بلا لو، مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ بھڑ آ بھی نہ سکوں

تحفیل و الفاظ دونوں لحاظ سے یہ شعر اچھا بلند ہے کہ اس کے مصرعہ طرح کو چھوٹا اور اس پر کامیاب
کر دے گا نامحال تھا لیکن نزہت صدیقی نے محال کو آسان کر دیا۔ ان کی تصنیف کا شعر دیکھئے:

پھر پلٹ کر نہیں آیا وہ جو کہتا تھا کبھی
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
نزہت صدیقی نے پانچ شعری مختصری غزل کہا ہے۔ پوری کی پوری غزل بلند پایہ ہے اور
ان کی فطری صلاحیت شاعرانہ پر دلالت کرتی ہے اس لئے بقیا اشعار بھی دیکھتے چلئے:

مشق وہ شمع نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں
دل وہ اظہیم نہیں ہے کہ لٹا بھی نہ سکوں
تاب، دل میں اسے کھونے کی کہاں سے آئے
اور پاتا اسے چاہوں تو میں پا بھی نہ سکوں
خاک ہو جاؤں تو ممکن ہے، ہوا، لے جائے
میں کہ سنگ در جاؤں ہوں کہیں جا بھی نہ سکوں
زخم، دل کا ہے سو آنکھوں میں اتر آئے گا
راز ایسا ہے کہ چاہوں تو چھپا بھی نہ سکوں

عابد جعفری اور امجاز بزی کے مندرجہ ذیل اشعار بھی خوبصورت شاعری کی خوبصورت مثال ہیں۔

اتحناں لیتے ہیں غالب کی زمیں میں اظہر
شعر کہہ بھی نہ سکوں بات بنا بھی نہ سکوں
عابد جعفری

سینہ چاکاں وطن پر جو قیامت گزری
چاہوں رو دو سنا سنا تو سنا بھی نہ سکوں
امجاز بزی

رویف ”نون“ کا چوتھا مصرعہ تھا ”ہم کو تسلیم گواہی فرما دیجیے۔“ سچ بات یہ ہے کہ خود
غالب بھی اس زمین میں کوئی ایسا شعر نہیں نکال سکے جسے غیر معمولی کہا جاسکے یا جسے ان کی
غیر معمولی شاعرانہ فطانت کی دلیل بنا کر پیش کیا جاسکے۔ ایسے میں ”عابد غالب“ کے شاعروں کے
لئے اس زمین میں اشعار نکالنا آسان نہ تھا پھر بھی بعض نے بہت کامیاب طبع آزمائی کی ہے دو
تین شعر دیکھئے۔

حشر میں مجھ سے جو پوچھیں گے ترے ظلم کی بات
یاد آئی بھی تو کہہ دوں گا مجھے یاد نہیں
زندگی لطف کشاکش کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ چمن کیا کہ جہاں گھاس میں سیاد نہیں
ظلیل یوسف

دردِ دل، ایک عطا ہے کوئی بیدا نہیں
کیسے انسان ہو، احسان پہ بھی شاد نہیں
یہ وہ لگا ہے جہاں سارے ہیں باون گز کے
کون شاعر ہے سوا میرے، جو استاد نہیں
جوش مند دوزئی

روشنی بزمِ جنوں خواب، کہ مایہ بہشت
حیف اب کوچہٴ جاناں بھی تو آباد نہیں
دشت و صحرا کی، نہ اب، کوچہٴ جاناں کی خبر
دل گم گشت کو کچھ، اپنا پتا یاد نہیں
زہت صدیقی

رویف ”ی“ کے ساتھ طرعی مصرعوں پر ”بیاد غالب“ کے شعراء نے غزلیں کہی ہیں۔
افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ غزلیں پہلی دورو بیٹوں یعنی ”الف“ اور ”نون“ کی غزلوں کے
مقابلے میں یہ حیثیت مجموعی کمزور ہیں اور ایسا ہونا حیرت انگیز نہیں، وجہ یہ ہے کہ غالب کی جن
غزلوں سے مصرعہ طرعی دیئے گئے ہیں وہ غزلیں خود بھی غالب کی دوسری غزلوں کی بہ نسبت کمزور
ہیں۔ سات متعلقہ غزلوں میں سے صرف ایک غزل ایسی ہے جسے غالب کی بہترین غزلوں میں
شمار کیا جاسکتا ہے، میری مراد اس غزل سے ہے جو ”حال اچھا ہے، کمال اچھا ہے، سال اچھا ہے“
کی زمین میں ہے۔ ورنہ بقیہ چھ غزلیں بہت معمولی درجے کی ہیں۔ ان غزلوں کے اشعار میں اتنی
سکت نہیں کہ وہ زبانِ زوہدِ خلّاق ہو جاتے یا ضربِ انشال بن جاتے بلکہ سچ یہ ہے کہ خاص خاص
صاحبانِ ادب کے سوا غالب کی ان غزلوں کے اشعار شاید ہی کسی عام قاری کے ذہن میں محفوظ
ہوں۔ ایسے میں اگر ”بیاد غالب“ کے شعراء، بلند پایہ طرعی غزلیں کہنے میں کامیاب نہ ہو سکے، تو

اس سے ان کی سخن گوئی پر حرف نہیں آتا۔ یہ زمینیں اپنی ساخت و مزاج میں اتنی مشکل، ناگلفت اور ناہموار تھیں کہ ان میں اچھے اشعار نکالنا آسان نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ خود غالب بھی ان زمینوں میں اس پائے کے اشعار نہیں کہہ سکے جن کی بدولت انھیں شہرت عام دہائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے۔ ہاں ہمہ میں ”بیاد غالب“ کے شاعروں کو داد دینے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے ایسی سخت زمینوں میں طبع آزمائی کی اور بعض بہت اچھے اشعار نکال لئے۔ چند شعروں کیجئے:

ہم کہ دانشور بڑے، شاعر عظیم
سب کرشمے ہیں خیال خام کے
ضیاء ملک

نارسائی کاسپ تقدیر تھی
فاصلے تھے ایک یا دو گام کے
عبود تھوید مرام کس لئے
یہ مرے ناراض شانے تمام کے
صبوحا

چہرے پہ جو کھلکا ہے اسے پڑھ تو لیں مگر
اک اور داستان پس داستان ہے
اشفاق حسین

دور تھے ہم سے تو اندیشے تھے اور
قربتوں میں بدگمانی اور ہے
دشمنوں کی دشمنی کچھ کم نہ تھی
دوستوں کی مہربانی اور ہے
جوش مندوزئی

اور بھی ہیں لوگ پر اس شخص میں
ایک طرز ولستانی اور ہے
عقیدہ شاہن

چودھویں کا چاند ہے شک خوب ہے
اُن کا رنگ، اُن کی جوانی اور ہے
اطہر رضوی

ایک تو اُن گنت مسائل ہیں
اور پھر سوچنے کی عادت ہے
سلیم الہی زلفی

ہجرت کی منزلوں میں ہر اک خاندان کی
اک نسل مطمئن ہے، مگر اک اداس ہے
اشفاق حسین

اس کی صورت سے مشابہت تو مہتاب ہے خوب
اس کے اندر کی طرح ہے تو بلال اچھا ہے
عقیدہ شاہین

دل کو امید ہے اب تک ترے لوٹ آنے کی
پیاس کے دشت میں پادش کا خیال اچھا ہے
اشفاق حسین

عافیت میری جو پہچیں تو انھیں کہہ دینا
ہر نئے دہس میں بخاروں کا حال اچھا ہے
اطہر رضوی

لکھ بھر گریزوں جو نہ برسے نہ سکی
دل کے آئین میں ترے غم کا نہال اچھا ہے
سلیم صدیقی

مختصر یہ کہ اطہر رضوی صاحب کی ایجاد خیال کا مرقع ”بیاد غالب“ جس میں برصغیر سے
بہت دور یعنی کنیڈا میں مقیم ہیں سے زائد شعراء کی طرحی غزلیں شامل ہیں۔ اردو شعر و سخن کی تاریخ
میں ایک تازہ سبب میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک طرف راہ سفر میں قدم آگے
بڑھانے والوں کی رہنمائی کرے گا، دوسری طرف اطہر رضوی کے ہاتھوں غالب اور کلام غالب کی
مقبولیت کے پرچم کو بلند سے بلند تر کرنے کا وسیلہ بنے گا۔

دام آگہی: مغرب میں غالب شناسی کی تازہ مثال

”دام آگہی“ انگریزی زبان میں ہے اور کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) کی پروفیسر ڈاکٹر فرانسس ڈیبلو پریچٹ (Frances W. Pritchett) کی تصنیف ہے۔ فرانسس پریچٹ، کولمبیا یونیورسٹی کے شعبے ”ماڈرن انڈک لینگویجس“ میں ایک سرے سے پڑھاری ہیں اور شعبہ اردو کی چھ پرہیز ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور ذہن رسا ہے۔ اردو غزل، اور غزل کے آہنگ سے ان کے ذوق ادبی کو خاص مناسبت ہے چنانچہ اردو غزل کے سرمایے کو بیسویں صدی کے بعض اردو ناقدوں کی طرح فرانسس نے کم عیار و بے وقعت نہیں جانا بلکہ ان کے نزدیک غزل کی شاعری، اردو کی سب سے قیمتی اور ہمیشہ زندہ رہنے والی شاعری ہے اور اسے کم مایہ خیال کرنے والے غلطی پر ہیں۔

پروفیسر فرانسس پریچٹ کو موسیقی، عروض اور داستان و فن داستان سے بھی گہری دلچسپی ہے اور ان سب پر بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے۔ اردو کی طرح انھیں جدید ہندی اور ناگری رسم الخط سے بھی پوری واقفیت ہے لیکن انہی کے بقول، غزل کے حوالے سے اردو زبان سے انھیں عشق ہے اور ان کا زیادہ وقت اردو کے مطالعے میں صرف ہوتا ہے۔

پروفیسر فرانسس پریچٹ سے میری پہلی ملاقات کوئی چودہ پندرہ سال پہلے دہلی میں ڈاکٹر گوپا چند نارنگ کے گھر پر ہوئی تھی، پھر اس کے بعد وہ جب بھی پاکستان آئیں مجھے ملاقات کا موقع دیا اور میں بھی جب کبھی امریکہ گیا تو ان سے ضرور ملا اور یوں ان کے میرے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً اب سے دو سال پہلے جب میرے کچھ دوستوں اور شاگردوں نے امریکہ اور کینیڈا میں ”جشن فرمان“ کا ڈول ڈالا تو پروفیسر پریچٹ صلاب اس میں خوش دلی کے ساتھ

شریک ہوئیں اور مجھے اپنے کلمات حسین سے بھی سرفراز کیا۔

اس دلدادہ امریکہ میں جب ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء کی شام کو جناب ڈاکٹر عبدالرحمن عبدصاحب کے گھر ایک استقبالہ میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی لطف ارزانی و ایجاب طبع نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ انھوں نے مجھے ایک بہت خوبصورت فی شرٹ بطور تحفہ عطا فرمائی اور اس تحفے کی معرفت فرمان نوازی سے بڑھ کر انھوں نے اپنی اردو دوستی اور غالب شناسی کا ثبوت فراہم کیا۔ وہ اس طرح کئی شرٹ کے دامن پر نہایت خوشخط اور جلی حروف میں غالب کا یہ شعر مرقوم ہے۔

عشق سے طبیعت نے زبیت کا مزہ پایا

ورد کی دوا پائی ورد لا دوا پایا

اس شعر کو انھوں نے پہلے تحت اللفظ میں ایسے سوٹر وولڈ آؤن پیرائے میں حاضرین کو پڑھ کر سنایا کہ معنی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ شعر کی تاثیر بھی حاضرین کے دلوں میں اتر گئی۔ بعد کو انھوں نے دوسرے مصرعے کی طرف خصوصاً توجہ دلائی اور کہا کہ ”جب میں اس شعر کو تحفہ سیاہ پر لکھ کر طلبہ و طالبات کو پڑھاتی ہوں تو اس کے بعض الفاظ کی طرف خصوصاً توجہ دلاتی ہوں اور یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتی ہوں کہ اردو رسم الخط مشکل نہیں بہت آسان ہے۔ دیکھئے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بیشتر الفاظ کے حروف الگ الگ بغیر کسی جوڑ کے لکھے ہوئے ہیں۔

ذکورہ بالا فی شرٹ کے ساتھ پروفیسر فرانس نے ”وام آگہی“ نام کی اپنی وہ قیمتی کتاب بھی اپنے آئوگراف کے ساتھ مجھے عطا کی جس کا ذکر میں نے ابتدائی سطور میں کیا ہے۔ محترمہ فرانس سے تحائف وصول کرتے ہوئے میں نے اپنی کچھ نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے متعلق اپنی وہ تازہ کتاب بھی ان کی خدمت میں پیش کی جس کا اقتساب میں نے ان کے نام نامی کے ساتھ کیا تھا۔ نشست کے آخر میں حاضرین میں سے بعض نے اردو زبان و ادب اور ان کی تدریس و تنقید کے بارے میں کچھ سوالات کیے جن میں سے کچھ کے جوابات میں بنے اور بیشتر کے جوابات پروفیسر فرانس نے اردو زبان میں دیئے۔ آخر میں کسی نے فرانس سے پوچھا ”اردو میں آپ کا پسندیدہ شاعر کون ہے؟“ جواب دیا گیا ”غالب“ اس جواب کے فوراً بعد فرانکس کروئی گلی کر اچھا تو غالب کے دو ایک پسندیدہ شعر سنائیے۔ فرانس نے نہایت شستہ لہجے میں بے ساختہ یہ پانچ اشعار سنائے:

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پا ہیں
 کہ ہے سر پنچ مڑگان آہو پشت خار اپنا
 دونوں جہان دے کے وہ کچھ یہ خوش رہا
 یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ہے کہاں حنا کا دوسرا قدم یارب
 ہم نے دھبہ امکاں کو ایک نقش پا پایا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچائے
 مدعا حقا ہے اپنے عالم تقریر کا

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
 دامانگی شوق تراشے ہے بنائیں

فرانس کی زبان سے اعتماد بھرے لہجے میں یہ اشعار سن کر حاضرین حیرت زدہ رہ گئے اور
 مزید سوالات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ”دام آگہی“ انگریزی زبان میں ہے اور اس کا یہ نام غالب
 کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچائے
 مدعا حقا ہے اپنے عالم تقریر کا

کتاب کا اصل نام انگریزی میں ”Nest of Awareness“ ہے اور اس میں اردو
 شاعری اور اس کی تنقید کا کاغذی قصین جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلی کتاب دوسو چونتیس صفحات میں ہے
 اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب کتنی اہم ہے، اردو شاعری کے
 کن کن موضوعات و مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور کس عہد تک کی شاعری کو زیر بحث لاتی ہے؟ ان

سوالوں کے جوابات کے لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے ایک آدھ حصے اصل صورت ہی میں نقل کر دیے جائیں تاکہ بات بے کم دکاست قارئین تک پہنچ سکے۔

Nests of Awareness is a study of an episode in the cultural and literary history of late nineteenth century North India: a look at how the classical ghazal, which for centuries had been the pride and joy of Indo-Muslim culture, was abruptly dethroned and devalued within its own milieu, and by its own theorists. The break with tradition was so sharp that now a days some aspects of the ghazal are obscure, and others even markedly distasteful, to most modern readers. I argue that the cause of this abrupt "paradigm shift" was not ultimately literary so much as political. The violent "Mutiny" of 1857, and the vengeful British reaction to it, destroyed the said world of the Indo-Muslim elite. After 1857, the victorious British had the only game in town: they were obviously, "naturally" superior, and they made, the everyone realized it. Azad himself, in another context, described the fault. "The important thing is that the glory of the winners" ascendant fortune gives everything of theirs -- even their dress, their gait, their conversation -- a radiance that makes them desirable. And people do not merely adopt them, but are proud to adopt them. Then they bring forth, by means of intellectual arguments, many benefits of this."

Such adoption of a new culture may be a fine thing, certainly both Azad and Hali were officially and strongly committed to the benefits of Westernization. But however good a face they managed to put on it, the result was clear: after 1857 they found themselves having to perform radical surgery on their own culture, to enable it to survive in a world defined by the victors. Azad and Hali set out to replace their

inherited Indo-Persian concept of poetry with what they understood to be the contemporary English one: a Wordsworth-like vision of "natural" poetry.

If Wordsworthian poetry was the touchstone of naturalness, however, the whole Indo-Muslim poetic tradition was bound to appear "unnatural" in comparison -- not just literarily decadent, artificial, and false, but morally suspect as well. And if, as many English writers argued, poetry was inevitably a mirror of society, then the cultural form must go much deeper. The result was sweeping, internally generated indictment with which Urdu speakers have been struggling ever since. A History of Urdu Literature was reprinted in 1984, shortly before its author's death, in an expanded second edition. Professor Sadiq added much new material; but he did not change a word of his harsh attack on the ghazal.

The present study has three parts: in the first part I locate the lives of my two central characters, Azad and Hali, within their cultural and literary setting; in the second part I seek to reconstruct the orally transmitted poetic concepts that Azad and Hali inherited -- concepts that are now little known and even less understood; in the third part I analyze the new anticlassical poetics that Azad and Hali defined with such urgency and power.

I hope, of course, that this book will be useful to lovers of Urdu literature both here and in South Asia, and to scholars of North Indian culture and history. But I have also tried my best to make the subject as vivid and interesting to others as it is to me. I will be delighted if people who know little or nothing about Urdu literature can find in this book a starting point. For this reason, I have included not only a glossary of key literary terms, but also an appendix containing an example

of ghazal, literally translated and with its parts explained. Also for this reason, I have used English sources whenever possible, so that the reader can consult them independently; usually, however, there aren't any, and in such cases all translations are my own.

This story takes place in North India only a little over a century ago, he blind of an eye in historical time. Worlds were in collision. The powerful momentum of the advancing British Raj encountered the political inertia of the declining Mughal Empire. The irresistible force met the heretofore immovable object -- and rolled over it. Azad and Hali, survivors of this great historical collision, were absolutely determined that their literature -- and with it their culture -- would not die from the shock. Their urgent attempts at triage, surgery, and sometimes euthanasia were not always successful. But their larger purpose was achieved. The Indo-Muslim community survived its darkest hours, learned to play the new game by the new rules, and was able once again to face the future with purpose and hope. Now, a century later, it can consider reclaiming some of the best achievements of the old game.

Our own generation can take pride in a widening rage of cultural encounters that has opened over time to more and more people. We expect cultures to clash, and we try to appreciate the dissonances. But we also know that (as Azad put it) "if you examine the temperaments of individual men who live thousands of mile apart and in countries with different characters, you will see, since human nature is one, to what extent their thoughts resemble each other's". Across the continents and the decades I salute Azad and Hali: with their backs to the wall, they had the courage to fight for survival

and renewal. They tried desperately to recognize their culture into lines of defense that could resist the Victorian onslaught. Even when they attacked their own poetry most bitterly, their love for it was never in doubt. And even when I disagree with them most strongly, I know that they would understand my own larger purpose. For we can now see that the poetry itself has stood firm over time. The Victorians are dead, and the ghazal lives.

Or at least, the British Victorians are dead; but many South Asian Victorians remain. They view the ghazal through the special distorting lenses provided by Azad and Hali – yet in many cases, such is the power of the poetry, they guiltily find themselves loving it anyway. This book is dedicated to the memory of Azad and Hali, and to everyone who loves classical Urdu Poetry. For nowadays cultures belong to those who choose them. And I am proud to consider myself an heir to the rich and inexhaustible tradition of the ghazal.

گویا کتاب حقیقت میں انیسویں صدی کے اواخر تک کی اردو شاعری کا پورا احاطہ کرتی ہے اور چونکہ اس ساری شاعری کا قاطبِ قدر اور ہمیشہ زندہ رہنے والا استادِ غزل کی صورت میں ہے، اس لئے پروفیسر فرانسس پرچٹ نے عملاً غزل ہی کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ غزل، غزل کے شعر، شعر میں الفاظ کے استعمال کی اہمیت، ظاہری اثرات، روایتی تلازمات اور رہنما وروانی پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے اور غزل کی اہمیت کو بالکل نئے انداز سے اجاگر کیا ہے۔ اردو شاعری کے کلاسیکی خاندانوں میں انھوں نے تذکرہ نگاروں کو بھی نظر میں رکھا ہے اور جگہ جگہ ان سے مدد لی ہے لیکن ان کی اصل توجہ محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی پر مرکوز رہی ہے۔ فرانسس نے ان دونوں کو اردو شاعری کا محافظ و مسیحا قرار دیا ہے اور ان کی کوششوں کو اردو شاعری کی اصلاح کے ساتھ ساتھ غزل کے احیا اور حیات نو کے لیے بھی قابلِ نیک جانا ہے۔ یہ نتائج انھوں نے دستِ مطالعے اور گہرے غور و فکر کے بعد اخذ کیے ہیں اور تنقیدِ شعر کے باب میں اپنی بالغ نظری و بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

غالب سے متعلق اپنی کتابوں کے دیباچے

دیباچہ ”غالب شاعرِ امروز و فردا“

اُردو میں غالب کا نام بالعموم سیر، نظیر اور اقبال کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ تینوں اردو کے منفرد اور ممتاز شاعر ہیں لیکن غالب کی حیثیت ان سے بہت مختلف ہے۔ غالب صرف عظیم شاعر ہی نہیں، عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری اور نثر دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ دونوں کو ایک نہایت دل کش، فکر انگیز، اچھوتا، تہہ دار اور پرکار و باوقار لب و لہجہ دیا ہے۔ ایسا لب و لہجہ جس کی کوئی دوسری مثال اُردو میں نظر نہیں آتی۔ اس لیے اُن کا نام دنیا کے صرف ان گنے چنے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ لینا مناسب ہو گا جو بہ یک وقت، نثر و نظم دونوں میں منفرد خلاقی حیثیتوں کے مالک ہیں۔

اُردو نثر میں غالب کی یادگار صرف اُن کے مکتوبات ہیں، لیکن یہ مکتوب محض مکتوب نہیں رہے، ادب کا لازوال سرمایہ بن گئے ہیں۔ یہ سرمایہ تخلیقی حیثیت سے اُردو میں ”گلستانِ سعدی“ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس کی سادگی، دلکشی اور اثر پذیر و اثر آفرینی کے نشانات سرسید سے لے کر مولانا حالی، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، سید وقار عظیم، آل احمد سرور اور ڈاکٹر ابوالیث صدیقی تک، ہر جدید نثر نگار کے یہاں صاف نظر آتے ہیں۔

شاعر کی حیثیت سے ان کی دین شاید اس سے بھی زیادہ ہے۔ اُردو و غزل کو انھوں نے ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا کیا ہے۔ اس میں عظمت و وقعت کے تازہ آثار پیدا کیے ہیں۔ تقلید و روایت سے بغاوت کر کے زندگی کے جدید تر میلانات و رجحانات میں تغزل کا رنگ بھرا ہے۔ اُردو

شاعری کو فکر انگیز تکیہ ساز اسلوب دے کر اُس کی سطح کو بلندی بخشی ہے۔ الفاظ کی شعبہ گری پر افکار کو ترجیح دی ہے۔ شاعری کو فطری منافی اور قافیہ بیانی کے عظم سے نکال کر فکر و شعور کی حیات افراد و خفا میں داخل کیا ہے۔ زمین اور زمین پر بسنے والوں کے مسائل و نفسیات کو شعر کا موضوع بنا کر زندگی اور ادب کا رشتہ استوار کیا ہے۔ بارہ و مسافر کے ذکر اور آرائش خم کا کل کے خفیل کو مشاہدہ حق کی گفتگو اور اندیشہ ہائے دور دراز کا حاصل قرار دیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی کو اعلیٰ انسانی مقاصد سے ہم آہنگ کر کے اُسے بنی نوع انسان کے زخمِ دل کا مرہم بنایا ہے۔

شعر و ادب کی طرح شاعروں اور ادیبوں پر بھی انھوں نے بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایک دوئیں، اُن کے بعد سارے چھوٹے بڑے شاعر و ادیب بقدرِ حصول اُن کے فکر و فن سے مستفید ہوئے ہیں۔ شاعروں میں پچھلے سو سال میں، حالی سے لے کر سجاد ہاقر رضوی تک سب نے کسی نہ کسی طور پر اُن سے اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال ادیبوں کا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہو جس نے غالب اور کلام غالب کے زیر اثر اُن پر اظہار خیال اور ان کے کمالاتِ فن کا اعتراف نہ کیا ہو۔

اُن کی ہم گیری اور ہمہ جہت اثر پذیری سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُن کی شخصیت معمولی نہیں غیر معمولی، اور اُن کا مقام بلند نہیں، حدودِ بلند ہے۔ اتنا بلند کہ اگر کوئی شخص بہ زعمِ خود اس بلندی تک دیکھنے کے لیے گردن اٹھائے اور احتیاط سے کام نہ لے تو اُس کی ٹوپی سر سے غائب نظر آئے گی یا وہ خود دھڑام سے زمین پر آ رہے گا۔ لوگ اُس کی حالت پر ہنس پڑیں گے، اس جگہ ہنسائی کے باوجود گرنے والا گھانے میں نہ رہے گا۔ ڈاکٹر عبداللطیف اور مرزا یگانہ چغتیزی کی طرح اُس کا نام بھی بہر حال غالب کے خفیلِ شہرت پا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیائے ادب میں اس کا شارِ خن فہموں میں نہیں، طرفِ داروں میں کیا جائے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ احترام و احتیاط کے ساتھ غالب کے فکر و فن کی بلند چوٹیوں پر نظر ڈالنے کی کوشش کریں اور آپ کی نظر کسی چوٹی تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائے تو اس بلند نظری کی نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ جو بلندیاں اور خوبیاں نبھائے خود آپ کی ذات میں سمجھیں ہوئی

ہیں وہ تجزی سے ابھر کر منظر عام پر آ جائیں اور دوسروں کو آپ کی بڑائی کا قائل بنادیں۔ یہ بات محض برائے بیت نہیں، واقعہ یہ ہے کہ اردو میں کئی ایسے محقق و نقاد ہیں جو اسی کوشش کی بدولت اپنے ہم عصروں میں ممتاز و سر بلند ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی نظر فلسفہ پر کتنی ہی گہری کیوں نہ رہی ہو، لیکن یقین جابے اگر وہ ”محاسن غالب“ کے نام سے ایک مقالہ نہ لکھ جاتے تو اردو ادب میں ان کے زندہ رہنے کی گنجائش نہ نکلتی، نقاد کی حیثیت سے کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا۔

شیخ محمد اکرام نے اسلامی ثقافت اور ملی تحریکات پر جو کچھ بھی لکھا ہو، ہمیں سہرست اس سے سروکار نہیں، لیکن اتنا سب جانتے ہیں کہ اردو ادب میں انھیں جو شہرت و عزت ملی ہے وہ صرف ”غالب نامہ“، ”آثار غالب“ اور ”ارمغان غالب“ کے مصنف کی حیثیت سے ملی ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی بخش پر شاہ، مولانا غلام رسول مہر، مولانا امتیاز علی خان مرثی، قاضی مہد اور دو، مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے علمی و ادبی کارنامے اور بھی ہیں لیکن اردو تحقیق و تنقید میں انھیں جو اعزاز و بلند مقام حاصل ہے وہ غالب اور غالبیات پر گہری نظر رکھنے ہی کا انعام ہے۔

بعض دوسرے اہل قلم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر شوکت سبزواری ایک معتبر نقاد کی حیثیت سے اوّل اوّل ”فلسفہ کلام غالب“ ہی کی بدولت سامنے آئے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر آفتاب احمد نے کچھ زیادہ نہیں لکھا، پھر بھی اپنے حشرق مضامین میں انھوں نے غالب کے سلسلے میں جس ڈرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے، اُس نے انھیں صاحب بصیرت ناقدوں کی صف میں لاکر رکھا ہے۔

پروفیسر سید نعیم الرحمن، ہر چند کہ پچھلے چند برسوں سے باقاعدہ لکھ رہے ہیں لیکن پچھلے دو سال میں مخصوصیت سے انھوں نے غالب کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اور غالبیات سے متعلق تنقیدی اور تحقیقی تفصیلات کے ساتھ جو ”اشاریہ غالب“ تیار کیا ہے، اُسی نے ان کے قلم کو طس و ادبی حلقوں میں اتنی جلد معتبر و موثر بنایا ہے۔

ڈاکٹر ظلیق انجم، اکبر علی خان، مسلم نیائی، قدرت نقوی اور ڈاکٹر راشد فاروقی کے تقریروں کو بھی تجزی سے رُسمہ اعتبار تک پہنچانے میں غالب کا بڑا ہاتھ ہے۔

مولوی عبدالباری آسی، بے خود مولائی، قاضی سعید الدین، قلم طباطبائی، آغا محمد باقر، پروفیسر سلیم چشتی، شوکت میرٹھی اور اس طرح کے کتنے اہل قلم ہیں جو صرف کلام غالب کی شرح لکھنے کے سبب ہماری قوت کا سرگز بنے ہیں۔

بھی کیفیت اُن مضموروں کی ہے جنہوں نے کلام غالب کے تصویری مرقعے تیار کیے ہیں۔ عبدالرحمن چغتائی اور صادقین نے ہمیں غالب کی عظمت کا احساس دلایا ہو یا نہ دلایا ہو، غالب نے ہمیں اُن کی عظمت کا احساس ضرور دلایا ہے۔ یہی نہیں، غالب کا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ شاعری نے اُن کے نام کو نہیں بلکہ خود انہوں نے شاعری کے نام کو اونچا کیا ہے:

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راغنی غالب

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردِ فین ما

ان مختصرات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غالب کی شخصیت ایک پہلوئیں ہشت پہلو ہے۔ اُن کا فن ایک رنگ نہیں صدر رنگ ہے۔ اُن کی ادبیت ایک شیوہ نہیں ہزار شیوہ ہے۔ اُن کی ذات ایک صفت نہیں جامع الصفات ہے۔ اردو میں اُن کی اولیات ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں اور شعرو ادب پر ان کے احسانات دو چار نہیں بے شمار ہیں۔

اب اگر اپنی ذات کے حوالے سے میں یہ کہوں کہ اس ہمہ جہت و ہمہ گیر شخصیت سے میرا تعلق صرف دینی ہی نہیں، جذباتی بھی ہے اور آج سے نہیں شروع ہی سے ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اس لیے کہ مجھ جیسے ادب کے نہ جانے کتنے طالب علم اُن سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں گے لیکن میں نے جو بات کہی ہے وہ نئی یا انوکھی نہ سہی، سچ ضرور ہے اور سچ بات نئی بات سے کم اہم نہیں ہوتی۔ میں نے اسی کتاب میں کسی جگہ لکھا ہے کہ میں غالب کے اس دعویٰ ثبوت پر:

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے

دلیان مرا شہرت پر دیں بودے

غالب اگر اس فن سخن دین بودے
آں دین را ایزدی کتاب اس بودے

اس وقت سے ایمان لایا ہوں۔

کہ مجھوں لام الحلف لگتا تھا دیوار دیوتاں پر

ہوایوں کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک، گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا، اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ میرے ذہن کے لاشعور خانے کا جزو بن گئے۔ جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان اُن کی نبوت شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راجہ اور مشکل کشا بن گئے۔

یہ مشکل کشائی اور اجنائی میری حد تک کس نوع کی ہے، اس کی تفصیل بھی آپ کو اسی کتاب میں کسی جگہ مل جائے گی۔ یہاں اس بات کا اعادہ الہتہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور مطالعہ غالب کا یہ فیضان میرے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ صلائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صلائے عام کی کیا صورت ہے، اس سلسلے میں، میں کیا عرض کروں۔ میرے دل کی بات، بابا یونیورسٹی شعبہ اردو میں غالبیات کے پروفیسر سید وقار عظیم صاحب نے اپنی مختصر سی حالیہ گفتگو میں حسب مزاج و موقع بڑے سلیقے سے کہہ دی ہے:

”غالب کے شعر میں انسان کے نازک سے نازک، لطیف سے لطیف اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذبے اور احساس کو اظہار کی زبان عطا کرنے، اسے تصویر اور مجسمے کی صورت دینے اور تصویر و مجسمے میں روح پھونک دینے کی جو غیر معمولی قوت ہے، اس نے ہمارے لیے ہر تجربے کا ادراک ممکن بنا دیا ہے اور اس لیے غالب کا قاری جب اپنے کسی جذبے اور احساس کے معنی سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے یا اُس کی تہ تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے ایک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے تو غالب کا کوئی نہ کوئی شعر سامنے آ کر اس سے کہتا ہے کہ دیکھو، میں تمہاری آہمن اور تمہاری

کشف کی تفسیر ہوں۔ اس صورت حال میں انسان کو حوصلہ دینے اور اس کا حوصلہ برقرار رکھنے کے جو امکانات ہیں، انہوں نے غالب کے شعر کو ہر دل کی آواز بنا دیا ہے۔ آدی کو اگر یقین ہو جائے کہ دنیا میں کوئی ایسا ہے جو اس کے دکھ کے معنی سمجھتا ہے اور اسے اظہار کی زبان دے سکتا ہے تو اس کے لیے زندگی بسر کرنا اور زندگی کو بسر کرنے کی چیز سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ غالب کے کلام نے اردو کے ہر شاعر سے زیادہ یہ خدمت انجام دی ہے۔ صرف دکھوں ہی کی بات نہیں ہر انسانی تجربے کے معاملے میں غالب کے شعر اور اس شعر کے پڑھنے والے کے ساتھ یہی صورت ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ بین بلائے اس کا رفیق اور دم ساز بن جاتا ہے۔“

یہ کتاب دراصل غالب کی اسی رفاقت و دم سازی کا اعتراف اور ان کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان کی روح کے حضور ایک ادنیٰ سا سپاس نامہ ہے۔

غالب کا کلام جسے ان کے ”دل حیرت زدہ“ کی تفسیر کہا جاسکے۔ ایک ”مائدہ لذت درد“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ہر لوگ جلد دل و دماغ اپنا اپنا کام تو نکال سکتے ہیں، لیکن اپنی کسی ایک تحریر یا کتاب سے غالب کے خن فہموں کو سیراب نہیں کر سکتے۔ کم از کم میں اپنے تئیں بھی محسوس کرتا ہوں اور اسی لیے میں اپنی اس کتاب کو غالب کے سلسلے میں ادنیٰ سپاس نامے کی حیثیت دیتا ہوں۔

میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غالب کے جملہ محاسن شعری پر محیط ہے یا اس میں غالب کی شخصیت اور فن کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ ہر طرح مکمل ہے۔ ہاں اس میں ان کی شخصیت و فن کے بعض ایسے بنیادی خال و خط ضرور مل جائیں گے، جن کی مدد سے ان کی ذات و صفات کے متعلق بھرپور تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض خال و خط ایسے ہو سکتے ہیں جنہیں پہلے بھی محسوس کیا گیا ہو گا یا جو اس سے پہلے بھی قارئین غالب کی نظر سے گزر چکے ہوں گے لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے جو نئے پن اور تازگی کا احساس دلائیں گے۔ اس

کتاب میں غالب کی زندگی اور فن کے بارے میں بعض نئی معلومات، نئے تجزیے اور نئی تاویلیں بھی ملیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان سے غالب کو نئے زاویے یا کم از کم میرے زاویے سے دیکھنے دکھانے میں مدد ملے گی۔

یہ کتاب چندہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ بعض تنقیدی کے تحت آتے ہیں اور بعض حقیقی و تنقیدی دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بعض مضامین مثلاً ”غالب کے کلام میں استہمام“، ”غالب کے مقلد“، ”تکمل شرح دیوان غالب پر ایک نظر“، ”غالب و اقبال“ اور ”غالب کے اسلوب سخن کا ایک اہم پہلو“ چندہ سے لے کر بیس سال پرانے ہیں اور میری تنقیدی تحریروں کے اولین نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی مضامین اس لحاظ سے نئے ہیں کہ پچھلے دو سال میں لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے، کتابی صورت میں غالب کے مکتوفوں کی مکمل تصویر نہ سہی، تصویر سی ضرور سامنے لے آتے ہیں اور غالب کے قارئین اس پس منظر کی مدد سے جو غالب اور عہد غالب کے مطالعہ کی حیثیت سے ان کے ذہن میں محفوظ ہوگا۔ اس تصویر کو یہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ ایک ایسی امید مان مضامین کو کتابی صورت میں یک جا کر دینے کا باعث ہوئی۔

یہ مضامین چونکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اس لیے پہلی بات تو یہ کہ ایک معنوی ربط و آہنگ کے باوجود موضوع کا تسلسل کہیں کہیں ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان مضامین میں آپ کو انتخاب اشعار، انداز بیان اور خیال کی تکرار بھی نظر آئے گی۔ امید ہے کہ اس سے صرف نظر کیا جائے گا کچھ تو غالب کی خاطر اور کچھ اس مجبوری کے پیش نظر کہ مقالات پر مشتمل کتابوں میں اس قسم کی کمزوریاں ناگزیر ہیں۔

دیباچہ ”تمثلاً کا دوسرا قدم اور غالب“

غالب کے فکر و فن کے بارے میں یہ میری دوسری کتاب ہے، پہلی کتاب ”غالب شاعر امروز و فردا“ غالب صدی کے جشن کے موقع پر شائع ہوئی تھی۔ گویا دوسری کتاب کم و بیش پچیس سال کے وقفے کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ یہ پچیس سال دوسری علمی و ادبی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ غالب اور غالبیات کو سینے سے لگائے رہنے میں گزرے ہیں۔ اس عرصے میں غالب کے بارے میں میرے کئی مضامین مختلف رسالوں میں چھپے اور اہل نظر کی توجہ کا مرکز بنے۔ ان میں جس مضمون کو میں نے اپنے شعور و لاشعور کا حاصل اور ایک طرح سے القائی انکشاف و تنقید کا جزو و جاناوہ ”کلام غالب میں لفظ تماثل کی تکرار بطور استعارہ فلسفیانہ جار“ تھا۔ اب یہی اس کتاب کا مضمون اول ہے۔

یہ مضمون اول اول ”اوراق“ لاہور میں چھپا پھر کی اور جگہ منتخب ہوا۔ اس مضمون میں، لفظ ”تماثل“ کو غالب کے مفکرانہ ذہن کی کلید بناتے ہوئے میں نے غالب کو ایک بشر و کی حیثیت سے اپنے مقصد فکر و فن میں علامہ اقبال کے فلسفہ حیات سے مماثل و مشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ صحیفہ غالب کے سلسلے میں میرے اس مضمون کی حیثیت کم و بیش وہی ہے جو میرے ایک پرانے مضمون ”کلام غالب میں استفہام“ کی تھی۔

غالب کے بارے میں میرا پہلا تنقیدی مضمون ”غالب کے کلام میں استفہام“ مئی ۱۹۵۴ء کے شمار (کھنڈ) میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون غالب اور غالبیات کے باب میں میرے اس طویل مطالعے اور مسلسل غور و فکر کا حاصل تھا، جسے میں ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے اپنائے

ہوئے تھا میرے حق میں یہ غالب کا احسان اور مطالعہ غالب کا فیضان تھا کہ میرے اس مضمون کو تنقید غالب کے سلسلے میں بالکل نیا اور چونکا دینے والا مضمون خیال کیا گیا۔ سارے علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے داودی گئی اور مجھے غالب کے حوالے سے پچھانا جانے لگا۔

”گزار“ میں اشاعت کے بعد ”غالب کے کلام میں استفہام“ میری کتاب ”تحقیق و تنقید“ مطبوعہ ماڈرن پبلشرز کراچی ۱۹۶۲ء میں شامل ہوا۔ ”تحقیق و تنقید“ کا ایک ایڈیشن اسی سال صافد بک ڈپو، اردو بازار روٹلی سے شائع ہوا اور اس طرح میرا یہ مضمون ہندوستان و پاکستان کے سارے ادب دوستوں اور غالب شناسوں تک پہنچ گیا۔ بعد میں مختلف رسالوں اور تالیفات کے لئے منتخب کیا گیا، متعدد اہل قلم نے اپنے مضامین میں اس کا حوالہ دیا اور اس کے اقتباسات سے اپنے مقالات کو مزین کر کے میری تو قیر بڑھائی۔ حتیٰ کہ غالب صدی کے موقع پر ”تنقید غالب کے سو سال“ کے زیر عنوان جو کتاب ”مجلس یادگار غالب“ لاہور سے شائع ہوئی اور جس میں ۱۸۶۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء کے درمیانی عرصے میں شائع ہونے والے صرف ان مضامین کو یکجہدی گئی تھی جو تنقید غالب کے سلسلے میں اور بیکسل خیال کئے گئے، اس میں بھی میرے اس مضمون کو شامل کیا گیا۔

بعد ازاں یہی مضمون میری کتاب ”غالب شاعر امروز و فردا“ مطبوعہ اظہار سنز، لاہور ۱۹۷۷ء میں شامل ہوا۔ کتاب مقبول ہوئی اور ہندوستان و پاکستان کے متعدد اہل قلم نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے تھروں میں اس مضمون کی بطور خاص نشان دہی کی۔ بعض نے تو اسے کچھ اس انداز سے حرز جان بنالیا کہ جب انھوں نے ”غالب کے کلام میں استفہام“ کے موضوع کو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنایا تو صرف خیالی اور توافقی کی عجیب و غریب کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کیفیت کو صرف میں نے نہیں بلکہ بعض غالب شناسوں نے بھی محسوس کیا اور یہ بعض جگہ ایک طرح کی بد مزگی کا باعث بنی اس سلسلے میں ایک بد مزگی کا مختصر حال سننے چلئے۔

اردو کے معروف نقاد جناب اسلوب احمد انصاری صاحب کو میرا مضمون ”غالب کے کلام میں استفہام“ خاص طور پر پسند تھا۔ کئی خطوں میں اس کی داودی تھی۔ چنانچہ ۲۱ مارچ ۱۹۸۶ء کے ایک خط میں بھی مجھے انھوں نے لکھا:

”مکرمی فرمان صاحب!

السلام علیکم۔ اس سے قبل ایک خط اس غرض سے ارسال کر چکا ہوں کہ

پروفیسر خلیفہ منظور حسین صاحب کی بیاسویں سالگرہ کے موقع پر ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں، جس میں صرف غالب اور اقبال پر مضامین ہوں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اگر غالب کی شاعری کے کسی پہلو پر، جیسا مضمون کہ آپ نے غالب کے ہاں استفہامیہ لہجے پر لکھا تھا، لکھ کر مجھے دو تین صفحات کے اندر اندر روانہ فرمائیں تو بے حد ممنون ہوگا۔

خیر اندیش

اسلوب احمد انصاری

اس خط سے اندازہ کیجئے کہ میرا جو مضمون ۱۹۵۲ء کے نگار (کلکتہ) میں چھپا تھا، اسلوب احمد انصاری صاحب کے ذہن میں کس طرح تازہ تھا۔ لیکن انھوں نے کمال کر دکھا دیا کہ بالکل اس موضوع اور عنوان کا مضمون، وہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ”غالب سمینار“ کی ایک نشست میں پڑھنے بیٹھ گئے۔ اتفاق سے اس نشست کی صدارت مجھے سونپی گئی تھی اور اس میں ہندوستان کے اکابر ادب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے متعدد نامور اہل قلم مثل ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر انور سدید بھی موجود تھے۔ حیرت کی بات یہ ہوئی اسلوب احمد انصاری صاحب نے اشارہ دیکر اپنے مضمون میں میرے مضمون کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ جب مجھے نشست کے اختتام پر صدارتی کلمات کہنے کا موقع ملا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور اسلوب احمد انصاری کے تہاہل عارفانہ کی میں نے مکمل کر داد دی۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اس واقعے کو اپنے ایک مضمون ”مضمون ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات جلد سوم مرتبہ امراء طارق، کراچی ۱۹۹۳ء میں بہت قریب سے اور قدرے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

میرے مضمون ”غالب کے کلام میں استفہام“ کے سلسلے میں اسی نوعیت کا ایک نوادر، جناب محسن الرحمن فاروقی صاحب کے مضمون کے ساتھ پیش آیا تو ”اندازہ بنگلو کیا ہے“ کے زیر عنوان کتابی دنیا، دہلی، بابت ستمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے اس مضمون کو میں نے اکتوبر ۱۹۸۸ء کے نگار پاکستان میں اپنے مضمون کے دوش بدوش ادارتی نوٹ کے ساتھ دوبارہ کراچی سے شائع کیا۔ میرے اور ان کے مضمون میں جس طرح کی لفظی و معنوی ہم رنگی و مماثلت تھی اس کا بھی غالب شناسوں نے خاطر خواہ نوٹس لیا۔ متعدد خطوط آئے اور بعض نے اپنے تحقیقی و تنقیدی

مقالات میں بھی اس کا بطور خاص حوالہ بھی دیا۔

ممتاز غالب شناس پروفیسر سید مصین الرحمن صاحب نے ”ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی“ کے زیر عنوان اپنے مضمون مطبوعہ و مشمولہ ”ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات“ جلد اول، مطبوعہ ۱۹۹۳ء، کراچی میں لکھا۔

”غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پہلا معلوم مقالہ ”غالب کے کلام میں استقبہام“ کے موضوع پر ہے۔“ غالب شاعر امروز و فردا“ میں شامل ان کا یہ مقالہ چالیس چالیس برس پہلے رسالہ ”نگار“ نکتہ شمارہ مئی ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع پر غالبیات میں پہلا مقالہ اور مطالعہ ہے بلکہ اب سے چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلپذیری اور اس کی شادابی اور تازگی میں سرمو فرق نہیں آیا۔

کلام غالب کے استقبہامیہ لب و لہجے کے بارے میں اس خیال افریز اور خیال انگیز مقالے نے غور و فکر کی راہیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔

جناب خمس الرحمن فاروقی نے رسالہ ”غالب نامہ“ دہلی (شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء میں فرمان صاحب کا حوالہ دیتے بغیر ”انداز تنقید کیا ہے؟“ کے عنوان سے غالب کے طرز استقبہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ”خمس الرحمن فاروقی صاحب کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے ”غالب کے کلام میں استقبہام“ (مطبوعہ نگار، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

(خمیس ”غالب نامہ“ تجزیاتی مطالعہ، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ان کی ایک کتاب تحقیق و تنقید (کراچی ۱۹۶۳ء) نیز ان کی ایک دوسری بہت اہم کتاب ”غالب شاعر امروز و فردا“ (لاہور ۱۹۷۰ء) میں بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ ”تنقید غالب کے سوسال“ نامی کتاب (مرتبہ فیاض محمود، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء) میں بھی منتخب ہوا۔

میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔“

بات کہاں سے کہاں پہنچی گئی، کہنا صرف یہ تھا کہ مجھے غالب اور کلام غالب سے طبعی دلچسپی

رہی ہے اور میں نے اپنے دیگر مطالعات پر مطالعہ غالب کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ اس سلسلے کا ایک واضح نشان میری زیر نظر کتاب ہے جو ”غالب شاعر امروز و فردا“ کے بعد غالب پر میری دوسری کاوش کے طور پر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ غالب صدی کے بعد سے اب تک میں نے یوں تو غالب کے سلسلے میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن زیر نظر کتاب میں صرف چند مقالات شامل ہیں۔ البتہ قلم کار کے طور پر ”غالب شاعر امروز و فردا“ سے بھی ایک آدھ چیزیں داخل کر دی ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مجھے غالب سے طبعی دلچسپی ہے لیکن اس میں ماحول و گرد و پیش کو بھی خاص داخل رہا ہے چنانچہ طبعاً میں غالب کے اس دعویٰ نبوت پر۔

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے

دیوان مرا شہرت پر دیں بودے

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے

آں دین را از دی کتاب ایں بودے

پر اس وقت ایمان لے آیا تھا، جب کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر لیکن ہوا یوں کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک گمراہ گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ ذہن کے لاشعور خانے کا اہم جزو بن گئے۔ پھر جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان ان کی نبوت شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آ یا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہ نما اور مشکل کشا بن گئے۔ اگر حقیقی سے تعبیر کیا جائے تو عرض کروں کہ اردو شاعری کی دنیا میں ہر چیز رو کے ساتھ توڑی دور چلنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی بلکہ آغا و سفر ہی میں راہبر کو پہچان لیا تھا۔ اس راہبر نے میری دنیائے قلب و ذہن کو کس کس انداز سے متاثر کیا ہے اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش کہاں، مجھلا اس قدر عرض کروں گا کہ زندگی اور شعر و ادب کے باب میں جتنا کچھ میں نے غالب سے سیکھا ہے کسی اور شاعر سے نہیں سیکھا۔

شاعری قافیہ بازی کی نہیں محنی آفرینی ہے۔ جزو کا قصہ نہیں دل گدازتہ کی تفسیر ہے۔ لڑکوں کا کھیل نہیں جزو میں کل کی نمائش ہے۔ قدر و گیمسو کی آرائش نہیں، وار و رس کی آزمائش ہے۔ دشمن و

غیر یادہ وسافر کا تذکرہ نہیں مشاہد حق کی گفتگو ہے۔ شعر و ادب کے سلسلے میں اس طرح کی بہت سی باتوں کا شعور و احساس ابتدا میں مجھے غالب ہی سے ملا ہے۔

فلسفہ جذبات، ذکرِ شہداء اور زندگی و ادب کے رشتوں کے متعلق تریگل اور میتھو آرملڈ سے لے کر علامہ اقبال و مجنوں کو رکھووری تک، پڑھنے کو تو کیا کچھ نہ پڑھا تھا لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اس وقت اتری جب غالب کے اس نوع کے شعر سامنے آئے:

کشاکش ہائے ہستی سے کرے گی سستی آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصتِ روانی کی

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہٴ بارِ بہاری کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بزرگِ بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہوں کو ہے شکا کا کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا حرا کیا

حکاکاتِ شعری اور تخیل کی گل کاری و رسائی کے بارے میں مقدمہٴ شعر و شاعری اور شعر و نظم میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن ذوق کی تھکنی اور ذہن کی سیرابی کا سامان اس وقت میرا آیا جب غالب کے اس قسم کے اشعار نظر سے گزرے:

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے دامن اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

رنگِ خلعتِ صبح بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے گلشنِ گلہائے ناز کا

مطر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا

ہے کہاں حملا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
زندگی کی کہاں گہی اور کار جہاں کی درازی کی خبر دوسرے شاعروں نے بھی دی تھی لیکن اس خیال کا
سچا لطف اس شعر کے بعد نصیب ہوا:

خوں ہو کے جگر آ نکھ سے پچا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

معاشی عدم مساوات کی لعنتوں، مزدور پر سرمایہ دار کی خفیتوں اور کسان پر جاگیردار کی
زبردستیوں کے قصے صرف یہی نہیں کہ پڑھے یا سنے تھے بلکہ اس قسم کے واقعات آنکھوں سے
دیکھے تھے لیکن جب تک غالب کا درج ذیل شعر نظر سے نہ گزرا تھا انکس واداری پر دولت و سرمایہ
کے جبر و استبداد کا پورا احساس نہ ہوا تھا۔

غارت مگر ناموس نہ ہو مگر ہوے زر
کیوں شلبد بگل باغ سے بازار میں آ دے

رجائیت کے انتہا پسند مبلغوں نے زندگی کو یکسر فساد اور قوطیت کے ازلی طرف داروں
نے اسے یکسر فم ثابت کر دکھانے کی کیا کیا نہ کوشش کی تھی لیکن جب غالب کے اس قسم کے اشعار
سامنے آئے:

آگ سے پانی میں بجھے دنت ماضی ہے صدا
ہر کوئی در بانگی میں نالہ سے دوچار ہے

کیوں گردشِ ہدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

جب اندازہ ہوا کہ فطرت انسانی اور لازماً بشریت سے دونوں بے خبر ہیں زندگی بھیجنا ایک

سے نہیں، غم اور خوشی دونوں سے عبارت ہے۔

ایجاز و اختصار اور معنی خیزی و معنی آفرینی کی تعریفیں پہلے بھی پڑھی تھیں لیکن اس قسم کے اشعار سے پہلے:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کون ہوتا ہے حریف مئے مر و المکن عشق
ہے مکز و لب ساقی میں صلا میرے بعد

یہ کچھ میں نہ آیا تھا کہ کوزے میں سمندر بند کرنا کسے کہتے ہیں اور محذوفات و مقدرات، شعر کی تاثیر کس طرح بڑھا دیتے ہیں۔

حیات و کائنات اور اس کے ارتقا کے متعلق ڈارون اور دوسرے مفکرین کے توسط سے کیا کچھ نہ سن رکھا تھا لیکن یہ راز کہ غزل میں ان خیالات کا حیات افروز اور نشاط خیز مصحف کس طرح ہونا چاہئے، ذیل کے اشعار سے منکشف ہوا:

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بہیں گے اور ستارے، اب آسمان کے لئے

--- ---

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
چشم نظر ہے آئینہ، دائم نقاب میں

فلسفیانہ طرز فکر اور حکیمانہ اسلوب کے متعلق یہ تو سن رکھا تھا کہ ایک عظیم شاعر جو کچھ کہتا ہے، استدلال کے ساتھ کہتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے ثبوت کے ساتھ کرتا ہے، لیکن شنیدہ کو دیدہ کی حیثیت اس قسم کے اشعار کے بعد نصیب ہوئی۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈوبو یا مجھ کو ہونے نے، نہ ہونا میں تو کیا ہوتا

یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بخلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستان نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پر ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

ادبی طنز و طرافت کے سلسلے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن اس کی لطافت و افاہیت، اس
وقت کچھ میں آئی جب مرزا نوشہ کے اس نوع کے اشعار مطالعہ میں آئے :-

تیشہ بلیبر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرکھٹے علماء رسوم و قیود تھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تھید بھگ ظریفی منصور نہیں

گرنی تھی ہم پہ برقی چمکی، نہ طور پہ
وہتے ہیں بادہ، ظرف قدح خوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رو شاس طلق، بے خطر!
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

شنیدۂ کہ ہے آتش نہ سوخت ابراہیم
پہ میں کہ ہے شرر و شطری تو ام سوخت

لفظ و معنی کے رابا باہمی پر بہت کچھ پڑھا تھا اور شاعری میں مدعاہیت و الفاظ کی حسن فیزی کے متعلق

”صدا حقِ احمر“ سے لے کر ”الحجم“ تک بہت کچھ سمجھا تھا لیکن جب تک یہ اشعار:
 شورِ چندِ ناصح نے دُلم پر تک جھڑکا
 آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا حرا پایا

تم کون سے تھے ایسے کمرے داد و ستد کے
 کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
 کچھ خیال آیا تھا دہشت کا کہ صحر ا جل گیا

نظر سے نہ گزرے تھے مدعایتِ فطری کو عیب کے سوا ہنر کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رجائیت اور
 رجائی نقطہ نظر کے متعلق، فلسفہ و نفسیات کی بحثوں اور اقبال کے سلیطے کی کتب و مقالات میں بہت
 کچھ پڑھا تھا لیکن یہ نکتہ کہ شعر و ادب میں اس نقطہ نظر کو کس سطح پر اور کس انداز سے ذیل ہونا
 چاہئے، غالب کے ان اشعار کے بعد سمجھ میں آیا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
 آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

بے تکلف در بلا بودن پہ از ہم بلاست
 قعر دریا سلسبیل و درونے دریا آتش است

غرض کہ غالب اور کلامِ غالب نے مجھے فکر و فن کے اُن گنت نکتے بھجائے ہیں اور ذہن
 کے نہ جانے کتنے گوشوں کو منور کیا ہے۔

اس طویل معِ خراشی کے ساتھ کتابِ آپ کی نذر ہے۔ کتاب کیسی ہے، اس کا جواب مجھے
 نہیں آپ کو دینا ہے۔

دیباچہ ”شرح و متن غزلیات غالب“

میں اپنی تحریروں میں بار بار اس بات کا اظہار کر چکا ہوں کہ غالب میرا محبوب ترین شاعر ہے، مجھے اس کے فکر و فکر سے طبعی مناسبت ہے اور میں اسے اردو کے ان چار بڑے شاعروں میں شمار کرتا ہوں جن میں غالب، اقبال، میر اور انیس کے نام آتے ہیں۔ غالب کو میں نے بوجہ اوائل عمری سے پڑھنا شروع کیا، پھر جس قدر ممکن ہو سکا اسے پڑھتا گیا اور آج بھی میرے ذوق و شوق ادبی کو جو سکون و سرور غالب کے مطالعے سے ہمرا آتا ہے وہ کسی اور ذیلے سے کم آتا ہے۔

اب اسے غالب سے میرے والہانہ لگاؤ کا نام دے لیا جائے یا اتفاق کہہ لیا جائے کہ میرے قلم سے پہلا تنقیدی مضمون غالب ہی کے بارے میں صادر ہوا اور یہ جگہ جگہ نقل ہونے اور حوالے کی چیز بننے سے پہلے، پہلی بار جون ۱۹۵۲ء کے شمار (تکھنوں) میں آج سے تقریباً اڑتالیس سال پہلے شائع ہوا۔ عنوان تھا:

”کلام غالب میں استلہام“

اب غور کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میرا یہ مضمون بھی شرح کلام غالب کے آثار میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ اس میں تنقید غالب کے باب میں پہلی بار یہ بات وضاحت سے زیر بحث لائی گئی ہے کہ قواعد اردو کے چند سادہ سے استلہامیے کلمات مثلاً کیا، کیسے، کیوں، کس، کیونکر، کون، کہاں، وغیرہ کلام غالب میں مستعمل ہو کر کیسے رنگارنگ و حیرت انگیز اور گھنیزہ سنی کا طلسم بن گئے ہیں۔ میرا یہ مضمون نہ صرف یہ کہ غالب شاعروں کے حلقے میں بلکہ اردو تنقید کے سارے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور تنقید و تہنیم غالب کے سلسلے میں اور تکمل

(Original) فکر و نظر کا حامل خیال کیا گیا۔

بعد ازاں غالب کے بارے میں مجھ سے جو دوسرا مضمون سپردِ قلم ہوا وہ بھی اتفاق سے کلام غالب کی شرحوں سے متعلق تھا اور یہ بھی میری کتاب ”غالب شاعر امروز و فردا“ مطبوعہ انٹرنیشنل سنٹر، لاہور ۱۹۶۹ء میں شامل ہونے سے قبل، پہلی بار جولائی ۱۹۵۳ء کے شمار (نکھنوں) میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی اصل محرک مولانا عبدالباری آسی کی وہ شرح کلام غالب تھی جو رواں صدی کی پانچویں دہائی میں چھپی تھی، بہت ضخیم تھی اور اس کے بارے میں شارح نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ کلام غالب کی بہترین مکمل شرح ہے لیکن میری نظر میں یہ شرح بہت ناقص تھی اور اسی لیے میں اپنی کم علمی کے باوجود اس شرح کو موضوع تنقید بنائے بغیر نہ رو سکا۔

میرے ان مضامین سے یہ بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ غالب شناسی کے سلسلے میں روزِ اوّل سے میرے مطالعے کا مرکزی تعلق غالب پر نکھسی جانے والی کتب یا مقالات سے نہیں بلکہ براہِ راست کلام غالب سے رہا ہے۔ اس ذوقِ مطالعے کے سبب سے تیس چالیس سال پہلے عام ادبی نشستوں میں بھی میری گفتگو کا محور و موضوع حکوم پھر کر، غالب اور کلام غالب سے متعلق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میرے قریبی دوستوں کا عمومی تقاضا یہ رہتا تھا کہ میں کلام غالب کی کوئی شرح قلم بند کروں۔ اس سلسلے میں ممتاز غالب شناس پروفیسر ڈاکٹر سید محسن الرحمن صاحب اور ممتاز افسانہ نگار امراؤ طارق کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق، لندن میں مقیم غالب کے پرستار اور میرے عزیز شاگرد محبوب احمد نقوی، تاج بک ڈپو لاہور کے کلوب دوست ناشر و مالک جناب نوید احمد، ملتان کے ممتاز کلوب و ناشر ڈاکٹر طاہر حق نسوی، اسلام آباد یونیورسٹی، محاذِ ہر کے پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر عقیلہ شاہین، میرے پیار قدیم محمد عمر اور جناب محمد حبیب صدیقی (مرحوم) اور آخراً خرم گورنمنٹ کالج مری کے پروفیسر عبدالعزیز ساحر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان سب کے مسلسل اصرار کے باوجود، اپنی دوسری مصروفیتوں کے سبب میرے لئے ۱۹۹۶ء سے قبل شرح درجِ ان غالب کے لئے وقت نکالنا ممکن نہ ہو سکا۔

۱۹۹۶ء میں اس کام کے لئے وقت کیسے مل گیا؟ سے بھی اتفاق یا حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں مجھے ضرورتاً امریکہ جانا پڑا۔ یہاں حسب سابق میں نے اپنی بیٹی ڈاکٹر شمیم کو راپے واماڈا ڈاکٹر سلمان کے ساتھ یو یارک میں قیام کیا لیکن اب کے شدید سردی کی لہر اور

طوفانی ژالہ باری نے نوب یارک پر ایسا رنگ کر رکھا تھا کہ نوب یارک کے مستقل پاسی بھی لرزہ بر اندام رہنے لگے تھے۔ سردی و برف باری کے سبب میرے لئے تو نوب یارک کا موسم یکسر ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ چاروا ناچار اپنے بیٹے ڈاکٹر سید ابصار علی کے پاس غلور پڑا کے شہر اور لینڈ و میں پناہ لی۔ یہاں کی نضا نوب یارک سے بہت مختلف بلکہ قدرے خوشگوار تھی۔ چنانچہ نوب یارک کی سرزوی سے نہپنے کے لئے یہاں دو مہینے قیام کیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ڈاکٹر ابصار کے گھر میں طب اور چند مذہبی کتابوں کے سوا کوئی اور کتاب نہ تھی۔ نتیجتاً صرف دیوان غالب مرتبہ مولانا حامد علی خاں مطبوعہ ۱۹۶۹ء لاہور، جسے میں ساتھ لے گیا تھا، میرا رفیق دوم ساز تھا۔ چند روز اس کی ورق گردانی کرنے اور غالب کے اشعار گنگنا نے میں گزر گئے لیکن بعد ازاں وقت کا ثناء دو بھر ہو گیا۔ سوچا کہ فکر و حافظے کی مدد سے تنقیدی مضمون کی صورت میں کچھ لکھ ڈالوں۔ یہ بھی کر دیکھا لیکن یہ مشکل صرف دو مضمون ایک اردو خود نوشت سے متعلق، دوسرا غالب سے متعلق ہو سکے، جنہیں بعد کو اشاعت کے لئے رسالے میں بھیج دیا گیا۔

کتابوں کے بغیر وقت گزارنا کتاب بڑا عذاب ہے اس کا حقیقی انداز مجھے اور لینڈ و کے قیام میں ہوا۔ صبح سویرے اٹھنے کی عادت نے وقت کو مزید گراں بار کر رکھا تھا اور صبح ساڑھے پانچ تا ساڑھے آٹھ بجے یعنی ٹاٹھتے سے پہلے تین گھنٹے کا وقت کا نا میرے لئے سخت دشوار ہوتا تھا۔ جب طرح کا عالم عذاب تھا۔ اس عالم عذاب میں ایک دن نہ جانے کیسے یک یک یہ بات ذہن میں آئی کہ کیوں نہ دیوان غالب کی شرح لکھنی شروع کر دی جائے۔ یہ خیال ایسا سکون بخش محسوس ہوا کہ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شرح دیوان غالب کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہو گیا اور میرا سارا وقت اسی کام میں گزرنے لگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا چوں کہ دیوان غالب کے سوا کوئی دوسری اندامی کتاب میری دسترس میں نہ تھی اس لئے میرا ذہن بعض اشعار کی تفہیم و شرح میں بڑی الجھن محسوس کرتا تھا پھر بھی میں بار بار غور کر کے اطمینان بخش تفہیم تک رسائی حاصل کر لینے کی کوشش کرتا تھا۔ اب خدا جانے یہ شرح دوسروں کے لئے بھی اطمینان بخش ثابت ہوگی یا نہیں لیکن چند وجوہ سے یہ کام میرے اپنے لئے نہ صرف یہ کہ سکون بخش رہا بلکہ ذہن دکھ کو ایک طرح کی توانائی بخشنے کا وسیلہ بھی بنا۔ اول اس لئے کہ اس طرح مجھے دیوان غالب کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شعر کو بالاحتیاج

جاننے اور سمجھنے کا موقع مل گیا اور کلام غالب کے درجنوں مقامات جو اس سے پہلے مجھے گنجلک محسوس ہو رہے تھے ذہن میں واضح ہو گئے۔ دوم اس لئے کہ اس مفرح مطالعے سے غالب کے ارتقائے ذہنی کے کئی ایسے گوشے صرے سامنے آ گئے جو اس سے پہلے میری نگاہ سے پوشیدہ تھے اس لئے کہ بعض اشعار مثلاً

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پا ہیں
کہ ہے سر پنچہ سڑکوں آ ہو پشت خار اپنا

یا

دہان ہر سب پیچا رہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک یوفا چہ چاہے تیری یوفائی کا

جو پہلے عجیبہ اور مہمل محسوس ہوتے تھے بار بار ذاتی غور و فکر کے بعد نہ صرف ہا معنی بلکہ نہایت فکر انگیز اور تہدار محسوس ہونے لگے۔

سوم اس لئے کہ دیوان غالب کے ہا قاعدہ اور مسلسل مطالعے سے غالب کا وہ تنقیدی و خود احتسابی ذہن بھی سامنے آ گیا جس نے ان سے اپنے کلام کی کات چھانٹ کرائی اور کچھ ایسی کات چھانٹ کرائی کہ غالب کی ساری غزلیں خواہ طرحی ہوں یا غیر طرحی اپنے ہم عصر شعراء کے مقابلے میں محدود و مختصر ہو کر نہ لگیں اور یہ انکشاف مجھ پر پہلی بار ہوا کہ

(۱) ان کی طویل سے طویل غزل صرف سولہ یا سترہ اشعار کی ہے اور یہ بھی تعداد میں صرف ایک ایک ہیں۔

(۲) میں کے قریب ان کی غزلیں یک شعری ہیں یعنی ان میں سے ہر غزل صرف ایک شعری کا حامل ہے۔

(۳) کم و بیش تیس غزلیں صرف دو دو شعری اور بچیس غزلیں صرف تین تین شعروں کی ہیں۔

غزلوں کے اس اختصار و قطع پرید سے پہلے ان کی کیا صورت تھی اور ان میں سے ہر ایک کے کتنے کتنے اشعار قلم زد کروئے گئے اور کیوں؟ ان سوالوں کے جوابات کے لئے وقت بھی چاہیے اور

تفصیل بھی۔ انشاء اللہ بہت جلد یہ مقالات کی صورت میں قارئین کی نظر سے گزریں گی۔ سروسٹ شرح غالب پر نظر ڈالنے کی حد خواست ہے، جو اس وقت یہ عنوان ”معانی و مطالب مع غزلیات غالب“ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ کی نگاہ میں یہ شرح کیسی ہے؟ یہ آپ جانیں۔ البتہ جیسا کہ دو چار غزلوں کی شرح دیکھنے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی اس کے بارے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس میں کوئی خوبی یا خصوصیت ہو یا نہ ہو لیکن میرے ذرا یہ نظر سے یہ شرح، تفہیم و تشریح کے باب میں خود کفیل ضرور ہے یعنی اس کے مطالعے سے عام قاری کے ذہن کی کثفی ہو جانی چاہیے اور اس کے لئے ادھر ادھر مزید سمجھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ہر چند کہ یہ شرح کم سے کم الفاظ میں لکھی گئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا ایک ایک شعر بہ اعتبار مفہوم پوری طرح مشروح ہے اور اس پر بے جا اختصار یا بے جا طوالت کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عموماً اسی عیب نے غالب کی بعض دوسری شرحوں کو ناقص بنا دیا ہے اور میری نظروں میں شارحین غالب کا یہی پہلو کھٹکتا رہا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرت موہانی جیسے دموغزن سے آگاہ اور نکات کلام غالب سے آشناء شارحین غالب، اب کہاں پیدا ہوں گے لیکن اختصار تو یہی کے سبب ان کی شرحیں وہ غرض پوری نہ کر سکیں جس کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اسی طرح کا عیب شاداں بگلرانی اور مولانا عبد الباقی آہی کی شرحوں میں ہے۔ ان بزرگوں نے شرح غالب کے سلسلے میں ایک جگہ نہیں جگہ جگہ ایسی بے جا طوالت اور غیر ضروری تشریحات سے کام لیا ہے کہ قاری کے لئے غالب کا شعر آسان ہو جانے کے بجائے کچھ اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بعض شارحین نے اپنی طرف سے تو بہت کم لکھا البتہ دوسری شرحوں سے ایک ایک شعر کی درجنوں یا معنی اور بے معنی تشریحات نقل کر کے شعر غالب کو سہل کرنے کے بجائے گور کھد کھدا بنا دیا ہے۔ آغا محمد باقر اور بعض دوسروں کی شرحیں اسی قبیل کی ہیں اور دراصل بحیثیت مجموعہ شروح کلام غالب کی یہی وہ کمزوریاں ہیں جن کے سبب میں سمجھی ان کی طرف سے مفسرین نہ ہوسکا اور یہی بے اطمینانی میرے لئے ایک اور شرح غالب کا جواز بن گئی۔

دو نہ ابتداء میں شرح کو مدلل بنانے کے لئے میں بھی خاصی تفصیلات میں چلا گیا تھا مثلاً

غالب کے اس شعری:

مختصہ معنی کا ظلم اس کو مجھے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آدے

شرح اس طور پر لکھی:

”بظاہر یوں لگتا ہے کہ جیسے اس شعر میں شاعر نے اپنے شعری ڈکشن کے بارے میں محض شاعرانہ تعلق سے کام لیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ میرے نزدیک غالب نے اپنے اس شعر کے ذریعے شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ کی رنگارنگی اور معنوی تہ و داری کی عمومی کیفیت کی جانب توجہ دلائی ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں ”مرے“ کی ضمیر صرف غالب کی نہیں بلکہ شاعروں کی عمومی جماعت کی ترجمان ہے۔

غالب کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شعر میں استعمال ہونے والا کوئی لفظ، سادہ یا پیٹ نہیں ہوتا بلکہ اپنے اندر ایک ظلمی کیفیت رکھتا ہے اور ظلم اسے کہتے ہیں جو اپنی ظاہری و معنوی سحر انگیزی سے ذہن کو بھر زدہ کر دیتا ہو۔ شعر میں استعمال ہونے والا کوئی لفظ اس لئے بھی ظلمی ہوتا ہے کہ وہ بہ اعتبار لغت اگرچہ معنی واحد کا ترجمان یا نمائندہ ہوتا ہے لیکن جب یہی لفظ شعر میں جگہ پاتا ہے تو دوسرے الفاظ سے منسلک اور ہم آہنگ ہو کر معنی کے متعدد رنگوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ سارے رنگ قاری یا سامع پر بیک وقت نہیں کھلتے بلکہ تادیر مطالعے میں رہنے کے بعد وقتاً فوقتاً بے نقاب ہوتے ہیں اور شاعر کی ذاتی و نفسی کیفیات کے مطابق اپنے معنوی منصب میں تبدیلی پیدا کر کے لحاظ اثر دیتا ہے۔ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں اور ان کا یہی کچھ سے کچھ ہو جاتا اور اصل نتیجہ معنی کا ظلم ہوتا ہے۔

اپنے سیاق و سباق کی مدد سے لفظ کی یہی تبدیلی ہے جو اس کی تاثیر کی کیفیت کو منجھد یا زمان و مکان میں مقید نہیں ہونے دیتی بلکہ سیال و رواں دواں رکھتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی خاص ماحول اور کسی خاص عہد میں کہا گیا شعر نہ تو صدیوں تک زندہ رہتا اور نہ اس میں وہ معنوی عموسیت پیدا ہوتی جو نسل و رنگ اور فضا و ماحول سے بالاتر و کرۂ زمین انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجہً اس بحث کی یہ ہے کہ شعر میں استعمال ہونے والا لفظ عموماً اکہرا اور سادہ نہیں بلکہ تہ و تہا اور ظلم

افروز ہوتا ہے۔ شعر میں لفظ کی تہہ داری و طلسم سازی کا یہ کوئی ایسا تصور نہیں جس کا اور اک آج سے پہلے نہ کیا گیا ہو۔ علم بیان و بدیع کے عالموں نے لفظ کی اس طلسم سازی کو مجازی معنی کی بحث میں موضوع گفتگو بنایا ہے لیکن کچھ چھل چند دھانیوں میں ساختیات و پس ساختیات کے مباحث کی معرفت اس کا اور اک جتنا واضح اور عام ہوا ہے اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ عموماً کسی خاص شعر میں کسی لفظ کے دو متعین یا الہامی ہونے پر بحث تو کی جاتی تھی لیکن کسی لفظ کو مختلف شعروں کے حوالے سے الفاظ کے مختلف گروہوں میں رکھ کر اس کے اندر پوشیدہ دوسرے معنوں کی طرف توجہ دلانے کا رواج نہ ہوا تھا۔ اس جانب توجہ دلانے کا سہرا اھیٹا آج کے تنقید نگاروں پر ہے۔ البتہ غالب کے ذہن میں لفظ کی معنوی تہہ داری کا یہی تصور تھا جس کے تحت انہوں نے شعر میں استعمال ہونے والے لفظ کو گھینے معنی کا طلسم قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے متعدد اشعار کے ذریعے لفظ کے طلسم ساز ہونے کا واضح ثبوت بھی فراہم کیا ہے اور مولانا جانی کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے ناقدوں نے ایہام و ابہام کے عنوان سے اس کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ کلام غالب کو اس خاص رخ سے دیکھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا۔

غالب کے مذکورہ بالا شعر میں ”طلسم“ کا لفظ بطور خاص اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شعر چوں کہ فکر و خیال اور جذبہ و احساس کو ایک ساتھ گوندھنے اور الفاظ کے خاص رشتے میں پردے سے جنم لیتا ہے اور یہ سارا عمل ساوہ نہیں و پیچیدہ ہوتا ہے اس لئے اپنی تعظیم و تحسین کے لیے الفاظ کی بخت اور اس بخت کی منامی سے گہری شیشاسائی و واقفیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک ایسے، جان دار، فکر انگیز اور تادیر زندہ رہنے والے شعری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک جہان معنی پوشیدہ رکھتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر خود غالب کے لفظوں میں یہ آرت کا نمونہ نہیں بلکہ لڑکوں کا کھیل ہے، خود کہتے ہیں:

قطرے میں دجلہ دکھائی دے اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا ہوا دید و دنا نہ ہوا

الفاظ کے ذریعے قطرے میں دریا اور جزو میں کل کو دیکھنے دکھانے کا یہ طلسماتی عمل جس کا دوسرا نام شعر ہے قاری یا سامع کے لئے ایک طرح کا قفل ابجد ہوتا ہے۔ اس قفل ابجد کو کھولنے اور اس کے طلسم سے واقف و لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شعر کا قاری اور سامع ہاشعور و

ہاذا وق ہونے کے ساتھ ساتھ لفظ کی معنیاں سیلوں، اس کے روایتی و ثقافتی رنگوں کے باہمی
 رشتوں، صوتی کیفیتوں اور لفظی آہنگوں کا ادراک بھی رکھتا ہو۔ اس کا یہ ادراک ہی لفظوں کی
 گہرائی سمجھ سکتا ہے اور ان گہرائیوں کا کھانا ہی حقیقتاً شعر کے قفل ابجد یا اس کے ظلم کا کھانا ہے۔
 کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ شاعری میں لفظ کی اہمیت معمولی نہیں غیر معمولی ہے اور فکر و خیال کی
 ساری گہرائیاں اور بلند پائیاں، لفظ ہی کے ظلم و سحر کاری کی معرفت ہم تک پہنچتی ہیں۔ دوسرے
 لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شعر کی تخلیقی و تنظیم دونوں کا منبع اول و آخر لفظ اور صرف لفظ
 ہے۔ چنانچہ جس شخص کی رسائی لفظ کے کتب تک نہیں وہ نہ تو اچھا شعر کہہ سکتا ہے اور نہ شعر کی تنظیم و
 تحسین کا کام خود بخود کر سکتا ہے۔

اشعار کی تصریحات کو طوالت سے بچانے کے لئے میں نے مذکورہ بالا وضاحتی انداز سے
 گریز کیا ہے جسے مولانا حالی نے ”یادگار غالب“ میں اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے ”محاسن کلام
 غالب“ میں یا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ”فکر اقبال“ اور شمس الرحمن فاروقی نے ”شعر شور انگیز“ میں
 اپنایا ہے۔ پھر بھی میں غالب سے اپنے غیر معمولی دانشمندی کے سبب غالب کے اشعار کی تشریح میں
 کچھ ایسا ڈوب جاتا تھا اور اس کے لفظی و معنوی محاسن کی توضیح کچھ اس انداز سے کرتے لگتا تھا کہ
 شرح کی حدود سے آگے بڑھ کر میرا نظم اور میری تحریر تاثراتی تنقید کے دائرے میں داخل ہو جاتی
 تھی۔

ایسے موقعوں پر میں تنبیہات کی وضاحتوں اور کنایات و استعارات کی تصریحات کو اپنی
 تصریحات سے شعوری طور پر خارج کر کے اور تنقیدی روش کو ترک کر کے، کم سے کم لفظوں میں اپنی
 بات مکمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کوشش میں ممکن ہے کہ بعض اشعار کی شرح قاری کے زاویہ
 نظر سے خام رہ گئی ہو، لیکن شعر کی مطلب نگاری کے سلسلے میں علم بیان و بدیع کی لمبی لمبی بحثیں
 چھیڑنا اور تشریح کو تنقید بنانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ حتیٰ الوسع میں نے شرح کو بس شرح کی حدود میں
 رہنے دیا ہے۔

محاسن شعری سے صرف نظر کر کے سیدھے ساوے اور مختصر لفظوں میں محض شعر کے مفہوم کو
 قارئین تک پہنچانے کی کوشش میں مجھے اپنے اوپر ایک اور جبر کرنا پڑا ہے اور وہ جبر یہ تھا کہ اسی
 مفہوم کے حامل دوسرے اشعار خواہ وہ خود غالب کے ہوں یا اردو قاری کے کسی دوسرے شاعر کے،

مثلاً اورج کرنے سے گریز کیا۔ اس گریز کو میں نے جبر کا نام یوں دیا ہے کہ شاعری میری کمزوری ہے اور میرے ذہن میں کچھ لگد، شعر اتنی کثرت سے محفوظ ہیں کہ معنوی اعتبار سے منفرد سے منفرد شعر کے ہم معنی شعر ذہن میں ابھر آتے ہیں اور میں بعض اوقات خواہ مخواہ ان کے محاسن و معائب کا تقابلی جائزہ لینے لگتا ہوں۔

اس تقابلی جائزے میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ تنقیدی مباحث پھیلتے چلے جاتے ہیں اور غالب کے شعر کا اصل مفہوم الگ دکھا رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق کار شرح غالب کے سلیطے میں مناسب نہ ہوتا۔ شرح کا قاری، اس بحث کو معلومات افزا تو جانتا اور حسب توفیق اس سے لطف اندوز بھی ہوتا لیکن شرح کا اصل مقصد، شاید حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے میں نے عموماً سروکار اس بات سے دکھا ہے کہ قاری کا ذہن براہ راست غالب کے شعر اور اس کے مفہوم سے وابستہ رہے۔

آخر میں یہ بھی بتانا چلوں کہ جب پریس بجوانے کی غرض سے میں اس شرح کا مینٹہ تیار کروانے لگا تو پورے مسودے پر نظر ثانی کی اور اس نظر ثانی کے سلیطے میں علی گڑھ کے سعید الدین احمد کی شرح مطلوبہ ۱۹۲۶ء سے بطور خاص مدد لی۔ اس لئے کہ میری نظر میں یہ شرح دوسری شرحوں سے بہتر ہے اور ایک مدت سے یعنی ہائی اسکول کے زمانہ طالب علمی سے میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۶ ستمبر ۱۹۹۹ء

”تعبیراتِ غالب“ کا دیباچہ

میری زیر نظر کتاب ”تعبیراتِ غالب“ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، غالب اور کلامِ غالب کی چند تعبیرات سے متعلق ہے۔ غالب، اردو شاعری کی تاریخ میں ایک تابعدارِ روزگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تابعدارِ عربی کا لفظ ہے اور انگریزی کے لفظ جھنڈس کے ترجمہ و متبادل کے طور پر اردو میں مستعمل ہے۔

انگریزی میں جھنڈس یا تابعدار غیر معمولی فطانت اور تخلیقی قوت رکھنے والے شخص کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جہنسن کے مطابق جھنڈس حد درجہ طاقتور ذہن یا دماغ کا مالک ہوتا ہے اور جھنڈس قسم کے لوگوں میں ایک قدر مشترک یہ ہوتی ہے کہ روشِ عام سے ہٹ کر چلنے اور دوسروں سے الگ تھلک رہنے کا زبردست رجحان و احساس رکھتے ہیں، اُن کی طبیعت عموماً حدِ دست کی پابند نہیں ہوتی بلکہ وہ جس راہ پر بھی چل پڑتے ہیں، اس میں اپنا ایک واضح نشان بنا لیتے ہیں۔ اُن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی پے نسبت زیادہ خود مگر و حساس ہوتے ہیں۔ روشِ عام پر چلنے سے گریز اور اپنا پرستی کا عنصر ان میں نہایت قوی ہوتا ہے۔

جھنڈس کی یہ بنیادی صفات، میرے مطالعے کے مطابق غالب میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور اسی لیے وہ اردو فارسی نثر و نظم کی جن اصناف کی طرف بھی چل پڑے، سب میں اپنا ایک امتیازی نشان بنالیا۔ تہذیبی و معاشرتی زندگی تو جیہ و جہنیم کے باپ میں بھی اُن کی یہی روش رہی۔ انھوں نے اپنے عہد کے سارے سیاسی و سماجی رویوں سے خود کو مربوط رکھا اور اپنی شاعری کو زندگی کی تعبیرات کے سلسلے میں ایک ایسا موقع بنا دیا کہ اُس میں صفِ اول کے سارے اردو شعرا کی

تعبیرات سمجھیں۔ ان تعبیروں میں ولی دکنی، میر وسو دا، آفتخ و تاج، مومن و حسرت، شاد و غانی، امیر و جگر اور بچا و اقبال، غرض کہ جملہ ممتاز شعرا کے فکر و فن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، گویا غالب کی شاعری، ایک خاص سطح پر ان سب کی ترجمانی و نمائندگی کرتی ہے اور اس اعجاز خاص سے کرتی ہے کہ ہمیں غالب کو اردو کا ہیڈ روز کا شاعر کہنا پڑتا ہے۔

غالب ڈراف نگاہی یا تعبیری بصیرت صرف ماضی و حال تک محدود نہ تھی بلکہ وہ اپنے بعد، آنے والے اُس عہد کو بھی دیکھ رہی تھی جو مغربی علوم و فنون کی تازہ قوتوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور جس کی تیز روشنی بشرقی کی آنکھ کو بہت جلد خیرہ کرنے والی تھی۔ غالب کی اس دیکھ بوری اور مستقبل جہی کے نتیجے میں ان کی شاعری تعبیرات حیات کا ایسا مرقع بن گئی جس کی تفہیم و تفسیر میں اردو کے ناقدین تقریباً دو سو سال سے لگے ہوئے ہیں مگر اپنی کادشوں سے نہ تو وہ خود کو مطمئن کر سکے اور نہ دوسروں کو۔ بلکہ ہوا یہ کہ ان کی تعبیریں، کلام غالب کی مزید تعبیروں کے لیے جواز پیدا کرتی گئیں۔ زیر نظر کتاب ”تعبیرات غالب“ انہی تعبیرات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب محترمہ نجمہ آمنت مجید ملک صاحبہ کی خصوصی تہیہ اور ادارہ یادگار غالب کے اہتمام خاص کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہے۔ میں دونوں کا شکر گزار و ممنون احسان ہوں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کراچی، ۲۳ مارچ ۲۰۰۲ء

غالب سے متعلق مضامین

غالب اور محاسنِ کلامِ غالب

”محاسنِ کلامِ غالب“ اردو کے نامور ادیب و نقاد ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے صرف ۳۳ سال کی (۱۹۱۸-۱۸۸۵ء) عمر پائی پھر بھی، اردو ادب کو بعض ایسی قیمتی تحریروں سے ملے جن کی معرفت وہ ہماری ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ شاعروں میں تو خیر بعض ایسے ہیں جو تیس بتیس سال کی عمر میں بھی اپنا کامل ذکر نشان چھوڑ گئے۔ میری مراد اردو میں دیا شنکر نسیم، مجاز لکھنوی، اختر شیرانی وغیرہ سے ہے، لیکن نثر میں ڈاکٹر بجنوری کے سوا کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر بجنوری ایک باہر روزگار تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ سب کا سب قدر اَوّل کی تحریروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے جیسا کہ اُن کی متفرق تحریروں کے مجموعے ”باقیاتِ بجنوری“ سے پتا چلتا ہے، انھوں نے خطوط بھی لکھے ہیں، ترجمے بھی کئے ہیں اور بعض علمی مضامین بھی قلم بند کئے ہیں لیکن ان سب سے قطع نظر، اردو میں ان کے دو بہت بڑے حوالے ہیں، ایک حوالہ انیسویں صدی کے بے مثال شاعر غالب کے تعلق سے ہے اور دوسرا حوالہ بیسویں صدی کے عظیم شاعر علامہ اقبال کی نسبت سے۔ اس وقت ڈاکٹر بجنوری کے بارے میں انہی دو حوالوں کی روشنی میں مختصراً کچھ عرض کیا جائے گا۔

غالب کے تعلق سے ڈاکٹر بجنوری کا پہلا حوالہ، اُن کا وہ مقالہ ہے جو ”محاسن کلام غالب“ کے نام سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نکلا گیا۔ پہلے انجمن ترقی اُردو کے سرماہی ترجمان ”اُردو ادب“ میں شائع ہوا اور بعد کو بطور مقدمہ ”دیوان غالب“ (نسخہ حمید یہ) ”مطبوعہ بھوپال ۱۹۳۱ء کی زینت بنا۔ ”نسخہ حمید یہ“ سے مراد غالب کے اُردو دیوان کا وہ قدم ترین نسخہ ہے جسے خود غالب نے بہ عمر ۳۳ سال ردیف وار مرتب کیا تھا اور جس میں حذف و ترسیم کے بعد اُن کا منتخب کلام موجودہ اُردو دیوان کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ موجودہ دیوان ان کی زندگی میں بھی کئی بار چھپا۔ پہلی بار ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۷ھ میں مطبع سید الاخبار دہلی سے، دوسری بار ۱۸۴۳ء/ ۱۲۶۳ھ میں مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی سے، تیسری بار ۱۸۶۱ء/ ۱۲۸۰ھ میں مطبع احمدی واقع شاہد روہ دہلی سے، چوتھی بار ۱۸۶۳ء/ ۱۲۷۹ھ میں مطبع نکھای بدایوں سے اور پانچویں بار ۱۸۶۳ء/ ۱۲۸۰ھ میں مطبع مفید غلافی آگرہ سے۔

مرزا نوشکی وفات کے بعد بھی اُن کے مرقعہ یا موجودہ دیوان کے ایسے نمبرے درجنوں ایڈیشن مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے لیکن ان سب کا طبع و ماخذ اور تاریخی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ اہم اُن کا وہ اُردو دیوان ہے جسے ”نسخہ حمید یہ“ کے نام سے مفتی انوار الحق نے ۱۹۳۱ء میں مرتب کر کے بھوپال سے شائع کیا۔ اس میں بطور مقدمہ ڈاکٹر بجنوری کا وہ مقالہ بھی شامل ہے جو ”محاسن کلام غالب“ کے عنوان سے کئی بار الگ کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔ یہی مقالہ یا مقدمہ ”نسخہ حمید یہ“ کے تعلق سے ہمارے نقادوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ بغض نے اسے غالب کی غیر ملل مذاہمی کا نام دیا اور بعض نے بجنوری کی تعریف میں محض ثلوث قرار دیا۔ ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے ابتدائی فقروں نے بطور خاص شہرت پائی اور بعض ناقدین کی ناگواری طبع کا باعث ہوئے۔ وہ فقرے یہ ہیں:

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب۔ لوح سے حست تک مشکل سے سوچتے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا فقرہ ہے جو اس سادہ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔“

(نسخہ حمید یہ، مطبوعہ بھوپال، ۱۹۳۱ء، ص ۳۳)

یہ فقرے جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اُردو کے بعض ادیبوں اور نقادوں کو سخت ناگوار گزرے، چنانچہ ان

فقروں کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر بجنوری پر ایک عرصے تک لعن طعن کی جاتی رہی۔ حالانکہ یہ لعن طعن محض لاطمی اور بے خبری پر مبنی تھی۔ اپنے فقروں میں ڈاکٹر بجنوری نے الہامی کتابوں کے حوالے سے دیوان غالب کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اساسی طور پر ڈاکٹر بجنوری کی جنہیں بلکہ خود غالب کی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے اپنے وجدانی فقروں میں صرف غالب کی موثر اور خوبصورت ترجمانی کردی ہے اور بجنوری کے نام پر ایک نعرۂ مستانہ لگا دیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کے ان جملوں پر تنقید کرنے والوں نے جانے کیوں غالب کی اس فارسی رباعی کو ذہن میں نہیں رکھا جس میں انھوں نے خود اپنے اردو دیوان کو ”کتاب ایزدی“ کہا ہے اور جو ڈاکٹر بجنوری کے مقالے ”محاسن کلام غالب“ کی چیشانی پر بھی درج ہے۔ یہ رباعی سننے چلے:

مگر شعر و سخن بہ دہر آئیں ہوئے

دیوان مرا شہرت پر دیں ہوئے

غالب اگر ایں فنِ سخن دیں ہوئے

آن دین را ایزدی کتاب ایں ہوئے

ڈاکٹر بجنوری اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو میں گھاپلی تنقید کی بنیاد لی اور غالب کو دنیا کے مختلف زبانوں کے بڑے شاعروں کے مقابل رکھ کر ان کے فکر و نظر اور قافی کمالات کی غیر معمولی رسائی پر روشنی ڈالی۔ بجنوری نے پہلی بار ہمیں اس بات کا احساس دلایا کہ غالب ایک چھوٹی زبان کا شاعر ہو کر بھی بہت بڑا شاعر ہے اور اس کا شاعرانہ مقام دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم تر درجے کا نہیں ہے۔ بقول بجنوری، غالب کی سوچ فلسفیانہ ہے اور اس نے اپنی اس فلسفیانہ سوچ کو شعر کے قالب میں ڈھال کر کمال فن کی معراج حاصل کر لی ہے۔ یہی وہ معراج فکر و فن ہے جس کی بنا پر ہمارے اکثر نقاد غالب کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان میں سے بعض نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں کلام غالب کو بھل و خرافات قرار دیا۔ اس کی ایک مثال ڈاکٹر عبدالملیک کی وہ کتاب ہے جو پہلے ۱۹۴۸ء میں بڑا ہان انگریزی شائع ہوئی پھر ۱۹۳۶ء میں اردو میں چھپی۔ آج اس طرح کی ساری تحریروں جو ڈاکٹر بجنوری کے مقالہ ”محاسن کلام غالب“ کے جواب میں یا ان کے خیالات کے رد میں لکھی گئیں۔ غیر مقبول اور بے معنی ہو گئی ہیں جب کہ ڈاکٹر بجنوری کا مقالہ اور غالب کی شاعری کے بارے میں ان کے خیالات کی گونج سارے علمی و ادبی حلقوں میں سنائی

دیتی ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ غالب کو ان دنوں ڈاکٹر بجنوری کے بیان کردہ محاسن فن کی روشنی ہی میں جانچنے پر کہنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اُردو میں ڈاکٹر بجنوری کا دوسرا اہم حوالہ ان کا وہ انگریزی مضمون ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کے ٹکرو فن کی تائید میں لکھا اور جو ڈاکٹر بجنوری کی زندگی میں انگریزی رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (East & West) میں شائع ہوا۔ بعد کو اُردو کے نامور محقق مالک رام نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ ۱۹۳۲ء میں رسالہ ”نیرنگ خیال“ کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔

اس مضمون کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۱۵ء میں جب علامہ اقبال کی مثنوی ”اسرارِ خودی“ پہلی بار شائع ہوئی تو اس کے بعض متدرجات کے خلاف بڑا شور مچا بلند ہوا۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ”اسرارِ خودی“ علامہ کی پہلی منضبط تصنیف ہے اور اس میں علامہ نے اپنے فلسفہ خودی کی توضیح کرتے ہوئے اپنے ٹکرو فن کا ذریعہ متعین کیا ہے اور علامہ اسی کتاب کی بدولت پہلے پہل دنیا کے سامنے ایک چمکدار نئے عالم شاعری حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

اس مثنوی کی مٹری تمہید اور حافظ شیرازی کے بارے میں اس کے بعض ابتدائی اشعار، علم و ادب کے بعض اکابر کی ناراضگی کا سبب ہوئے۔ وہ ابتدائی اشعار یہ تھے:

ہوشیار از حافظ صہا گسار	جامش از زہر اجل سرا یہ دار
آں فقیہ مقلب سے خوار گاہاں	آں امام اُمت بے چار گاہاں
گو سفند و نوا آموخت است	عشوہ و تاز و ادا آموخت است
در رموز عشق و مستی کاٹے	از خنہ خوں زہلے یا زہر پگے
بے نیاز از محفل حافظ گزر	الغدر از گوسفنداں الخدر

حتیٰ کہ خولید حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی جیسے صاحبِ نظر علامہ دوستوں نے بھی فکرِ اقبال کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ اس آواز کا ردِ علامہ کے پاس موجود تھا لیکن انھوں نے اس وقت دوسرے سارے کام چھوڑ کر لا حاصل بحث میں جُت پائند نہ کیا۔ البتہ ”اسرارِ خودی“ کی دوسری اشاعت میں اس کی تمہید اور حافظ شیرازی سے متعلق اشعار کو مثنوی سے خارج کر دیا۔ لیکن بعض اہلِ نظر نے علامہ کے خیالات کی مخالفت کے جواب میں خاموش رہنا پسند نہ کیا اور علمی دلائل کے ساتھ اقبال کی تائید میں گراں قدر مقالے لکھے۔ ان مقالہ نگاروں میں مولانا اسلم جیراچپوری اور

ڈاکٹر بجنوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

علامہ اقبال کے خیالات کی تائید میں ڈاکٹر بجنوری کا مقالہ فلسفیانہ نکات سے معمور اور عالمانہ تجزیوں سے بھرپور اسی انداز کا ہے جیسا کہ ”محسن کلام غالب“ کے عنوان سے انھوں نے ”نقطہ حمید یہ“ کے مقدمے میں لکھا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ڈاکٹر بجنوری کا یہ مقالہ پہلے شملہ کے انگریزی رسالہ ”ایسٹ اینڈ ویسٹ“ میں چھپا بعد کو مالک رام کے ذریعے اردو میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر اقبال نے ڈاکٹر بجنوری کے مضمون کو پسند کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

”رسالہ ’ایسٹ اینڈ ویسٹ‘ انگریزی کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کوئی کاپی مل گئی تو ارسال خدمت کروں گا۔“

بعد ازاں خود علامہ اقبال نے مکمل کر اپنے خطوط و مقالات میں اپنے فلسفہ خودی اور اپنے مثبت منصوبہ خاندہوں کی صراحت و تائید میں بہت کچھ لکھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیدار اصل ڈاکٹر بجنوری کا مقالہ تھا جس نے اقبال کی مخالفت میں اڑائی ہوئی گرد کو پوری طرح بھال دیا اور چونکہ ان کی مثنوی ”اسرار خودی“ کو ان کے فلسفہ حیات میں اساسی حیثیت حاصل تھی اس لیے جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مطالعہ اقبال کے سلسلے میں اس مثنوی کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی کی تشریح و تفسیر کے لیے اردو میں متعدد کتابیں اور سیکڑوں مقالے شائع ہوئے۔ انگریزی اور اردو کے ساتھ ساتھ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا لیکن اس کی موافقت و تحسین میں پہلا دلیل و مبسوط مقالہ ڈاکٹر بجنوری کا ہے۔

اب اس پس منظر میں دیکھئے تو کہنا پڑے گا کہ ڈاکٹر بجنوری اردو کے اولین پالغ نظروں باشعور اور وسیع الطالعہ نقاد ہیں جن کے قلم نے اردو کے دو بے مثال نابغہ شاعروں، اسد اللہ خاں غالب اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو مثبت انداز میں ہم سے متعارف کرایا اور اس طرح تقابلی تنقید کی ایک تازہ راہ اردو کو دکھادی۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کے بارے میں غالب اور اقبال کے تعلق سے اوپر جو ذکر آیا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں اور ان کی جانب ہمارے ناقدین و

محققین کو ضرور رجوع کرنا چاہیے تاکہ اصل حقائق سامنے آجائیں اور ڈاکٹر بجنوری کی باتوں کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے میں آسانی ہو جائے۔ غالب کے تعلق سے قاطبی توجہ بات یہ ہے کہ بجنوری کا جو مقالہ ”عنوان بطور مقدمہ“ پر عنوان ”محاسن کلام غالب“ نسخہ ”حمید یہ مرتبہ مطبعی انوار الحق مطبوعہ بمبئی پال ۱۹۲۱ء میں شامل ہے اس کا کلمہ یا اختتام غالب کے اس شعر پر ہوتا ہے۔

آئے ہے نکسی عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جانے کا سیلاب بلا میرے بعد

لیکن ۱۹۳۱ء کے رسالہ ”آردو“ میں بجنوری کا جو مقالہ ”عنوان“ ”محاسن کلام غالب“ شائع ہوا ہے اور بعد میں بھی کئی بار کتابی صورت میں چھپا ہے، وہ نسخہ ”حمید یہ“ میں شامل مقالے کے مقابلے میں قدرے طویل ہے یعنی کم از کم چھ سطریں کا مواد زائد ہے اور اس کا اختتام درج ذیل فقرے پر ہوتا ہے۔

”غالب نے حقیقت میں ورجیل (Virgil) کو بھی، جس کی نظم ”سکار

دریا“ کے متعلق مشہور ہے، مات کر دیا ہے۔“

یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں طبع شدہ مقالوں میں یہ کی بیشی آخر کیوں ہے اور اسی کے ساتھ یہ سوالات بھی ذہن میں ابھرتے ہیں کہ یہ ترمیم و تخیض یا اضافہ یا کی بیشی کب ہوئی، کس پس منظر میں ہوئی اور کن محرکات کے تحت ہوئی؟

آردو میں ڈاکٹر بجنوری کا دوسرا اہم حوالہ علامہ شیخ محمد اقبال سے متعلق ہے۔ اس کے سلسلے میں بھی بعض باتیں تحقیق طلب ہیں۔ یہ تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کی مثنوی ”اسرار خودی“ مطبوعہ ۱۹۱۵ء کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری ”بنڈیان انگریزی“ ایک مقالہ لکھا تھا، اور یہ پہلے پابل انگریزی رسالہ ”ایسٹ اینڈ ویسٹ“ میں ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔ بعد میں مالک رام نے اس کا آردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا ترجمہ ”نیرنگ خیال“ بابت ۱۹۳۲ء کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ بجنوری کے انگریزی مضمون میں علامہ اقبال کی ”اسرار اور رموز“ دونوں مثنویوں کا ذکر ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ علامہ اقبال کی مثنوی ”رموز بے خودی“ کی اشاعت اور بجنوری کی وفات، دونوں کا سال ۱۹۱۸ء ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ ڈاکٹر بجنوری کے مضمون میں ”رموز“ کا بھی تذکرہ آگیا۔ اس امر پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ اقبال اور بجنوری دونوں کے حوالے سے ادب کے قارئین کے ذہنوں میں الجھاؤ کا سبب بنارہے گا۔

آسی کی شرح دیوانِ غالب

مولانا آسی لکھنوی کی شرح دیوانِ غالب تمام موجودہ تصہروں اور شرحوں سے ضخیم ہے۔ اس میں میں صفحات کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں شیخ، موتہن اور ذوق کی زندگی و شاعری کا غالب سے موازنہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں غالب کے ان اشعار کی فہرست ہے جو انہوں نے فارسی سے ترجمہ کئے ہیں۔ تیسرے حصہ میں غالب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شرحوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے معانی و محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان تصہروں اور شرحوں میں حالی کی ”یادگار غالب“ علامہ بجنوری کی ”محاسن کلامِ غالب“ اور حسرت موہانی و نظم طباطبائی کی شرحیں بھی شامل ہیں۔۔۔ آسی صاحب نے ان شرحوں کی بے بضاحتی، قلم مطلب نگاری، بے جا طوالت اور بے محل اختصار پر اظہارِ تا مسف کیا ہے اور یہی چیز ”مکمل شرح دیوانِ غالب“ کی تعریف کا سبب ہوئی۔

یہ شرح با اعتبارِ جسامت دوسری شرحوں سے بھاری بھر کم ضرور ہے لیکن نہ ان معانی سے پاک ہے جو آسی صاحب دوسری شرحوں میں پاتے ہیں اور نہ وہ مطالب کی صحت کے اعتبار سے حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کی شرحوں سے بہتر ہے۔ آسی صاحب کہیں کہیں تو سہل مشع کے اشعار کی مطلب نگاری سے بھی پوری طور پر مہذبہ برآ نہیں ہو سکے۔

عرصہ ہوا مولانا عبدالحق اور مولانا حامد حسن قادری امرِ شرح پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اکثر مطالب کی صحت کر چکے ہیں۔ پھر بھی بعض امار کے مطالب صحت طلب ہیں۔

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے
دست کو دیکھ کے گھر یاد آبا

آسی صاحب فرماتے ہیں کہ: ”جس جنگل میں وحشت میں میں جا نکلا وہ بہت ہی ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھریا دیا رہا ہے کہ وہ بھی ویرانی میں اس سے مشابہ ہے بلکہ اس جنگل کی ویرانی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گھر لوٹ جائیں۔“

گھریا دآنے کے آسی صاحب نے دو سبب بیان فرمائے ہیں، اول یہ کہ وحشت بھی ویرانی میں گھر سے مشابہ ہے اور یا یہ کہ وحشت کی انتہائی ویرانی سے خوف طاری ہوتا ہے جس سے شاعر گھر لوٹ چلنے کی فکر کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عاشق نے وحشت کا رخ وحشت سمجھ کر کیا تھا یا بارگ ارم۔ وحشت نوروی پہ کمر بستگی تو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ گھری ویرانی ہندو طرف وحشت نہ تھی اور عاشق نے سوائے صحرا نوروی کی آسودگی کی خاطر گھر سے بھی زیادہ ویران مقام کی تلاش کی لیکن جب اس نے وحشت کی ویرانی اپنی توقعات اور خیالات کے مطابق نہ پائی تو وحشت کی غیر متوقع بے مانگی اور بے بضامتی پر طرد و استعجاب سے کہنے لگا۔ ع۔ ب۔ ”کوئی ویرانی ہی ویرانی ہے۔“ یعنی اس ویرانی کا کیا شمار ہے اس سے زیادہ تو اس کا گھر ہی وہاں وحشت ناک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کسی شے کے متعلق ایک اعلیٰ تصور قائم کر لیتا ہے۔۔۔ اور پھر وہ اس قائم کردہ تصور سے کم آترتی ہے تو اس صفات کی جس قدر بھی چیزیں مشابہے میں کبھی آتی ہیں سب کی سب سامنے آ جاتی ہیں اور موجودہ چیز کی غیر متوقع پستی ہو حیرت ہوتی ہے۔ دویم یہ کہ دوست کی عدم موجودگی میں گھر کا وحشت سے زیادہ ویران ہونا قرین القیاس بھی ہے اور شاعر کی قوت تخلیق کا کمال بھی۔

غالب نے اس خیال کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مختلف مقامات پر نظم کیا ہے مثلاً

آگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس شعر میں سبزہ و بہار کے لفظ سے خیال گزرتا ہے کہ شاید گھریا رہا ہے لیکن گھر میں سبزہ کا آسنا انتہائے ویرانی کی دلیل ہے۔ غالب کا یہ شعر بھی اسی خیال کا حامل ہے۔

چائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں

کسم نہیں اپنے گھر کی اورابی

قافی نے بھی اس خیال کو بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے:

یاں میرے قدم سے ہے دیرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے دیرانی

میں نے مجھوں پہ لڑکھن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آسی صاحب فرماتے ہیں: ”ہم وہ آشفۃ سرختے کہ کبھی سروپا کا ہوش نہیں رہا اور یہ حالت کچھ آج
ہی نہیں بلکہ بچپن میں بھی ایسے ہی تھے۔ انتہا یہ ہے کہ خوشی سے ہم نے مجھوں کے سر پر مارنے کو
جب پتھر اٹھایا تب اپنا سر یاد کیا۔“

مولانا نے اس شعر کی مطلب نگاری میں عجیب اختراع سے کام لیا ہے اول تو شعر کے کسی
لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر کی آشفۃ سری اور اپنے سروپا کی بے خبری حد سے گزر گئی ہے اور
اس کی حالت نہ صرف آج ایسی ہے بلکہ بچپن میں بھی یہی رنگ تھا اور اگر بقول آجی صاحب یہ
فرض بھی کر لیا جائے کہ آشفۃ سری کی وجہ سے شاعر کو سروپا کا ہوش نہیں ہے تو خوشی سے مجھوں پر
پتھر اٹھا اور پتھر اٹھاتے ہی اپنے سر کے تحفظ کا خیال آ جانا کیا معنی رکھتا ہے؟۔۔۔ پتھر اٹھاتے ہی
اپنے سر کا خیال آنا اس حقیقت پر دل ہے کہ پتھر اٹھانے والا نہ صرف انتہائی باہوش انسان ہے بلکہ
دورانہ پیش بھی اور اس خیال سے کہ کہیں مجھوں کی طرح اس کا بھی حشر نہ ہو اپنے مفلانہ اقدام سے
باز رہتا ہے۔ اس لئے آسی صاحب کی ”آشفۃ سری“ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

شاعر کا مقصود صرف یہ ہے کہ مجھ میں بچپن ہی سے عشق کا انتہائی احساس موجود تھا اور انتہا یہ
ہے کہ بچپن میں جب میں نے دوسرے بچوں کے ساتھ مجھوں پر پتھر اٹھایا تو مجھے یہ خیال ہوا کہ
کہیں میں بھی مجھوں کی طرح جلائے عشق نہ ہو جاؤں اور لڑکے اسی طرح میرے سر پر بھی سنگ
زنی کریں۔ غالب نے اس خیال کو دوسری جگہ بھی نظم کیا ہے:

فنا تعلیم دریں بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجھوں لام الف لکھتا تھا دیوار دیستان پر

رات دن گردوش میں ہیں سات آسماں
ہر سے گا کچھ نہ کچھ گھبرا نہیں کیا

آسی صاحب فرماتے ہیں: ”ہم کسی کام کے ہونے نہ ہونے سے کیوں گھبرائیں۔ سات آساں گردش میں ہیں ان کے پھرنے اور گردش کرنے کا آخر کوئی نتیجہ ضرور ہوگا اور جو کچھ ہونا ہوگا ضرور ہو کر رہے گا یا یہ کہ ہم جو زندگی سے گھبرا کر مرنے کے تنہا کی ہیں فصول ہے۔ آساں رات دن گردش کرتے ہیں آخراں کی گردش سے عمر ضرور تمام ہو جائے گی۔“

آسی صاحب نے مسلسل مہارت میں شعر کے دو مفہوم بیان فرمائے اذل یہ کہ ہم کسی کام کے ہونے نہ ہونے سے کیوں گھبرائیں سات آساں گردش میں ہیں ان کا کوئی نتیجہ ضرور ہوگا اور جو کچھ ہونا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ یہ دراصل شعری نثر ہے مطلب نہیں اس نثر سے زیادہ آسان تو خود غالب کا شعر ہے۔ دوسرا مطلب آسی صاحب یوں بیان فرماتے ہیں: ”ہم جو زندگی سے بے زار ہو کر مرنے کی تنہا کرتے ہیں بیکار ہے آساں کی گردش سے عمر ضرور تمام ہو جائے گی۔“ فاضل شارج نے یہ مطلب خود گوڑھا ہے ورنہ شعر کے کسی لفظ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر زندگی سے کریزاں ہے اور آلام سے چھٹکارے کی خاطر موت کا حتمی ہے اور اس مقصد پر آری کی اُمید گردش آساں سے لگائے ہوئے ہے۔ دوسرے مصرع میں ”گھبرائیں کیا“ کے کھڑے سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر حوادثِ زمانہ سے خائف نہیں ہے بلکہ اسے انقلاب یا گردشِ ملت چرخ سے امید افزا توقعات ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ انقلابات کا طوفان شاعری کا باعث ہی ہو سکتا ہے کہ انقلابات اور گردش آسانی کے اثرات شاعر کے موافق ہوں اور اس طرح اس کی بے اطمینانی سکون میں اور ناامیدی اُمید میں بدل جائے۔ حوصلہ مند مصنفین انقلاب کو ایک پائیدار حقیقت سمجھ کر خوش آمدید ہی کہتی ہیں اور اسے زندگی کے ارتقا کا جادو خاص سمجھتی ہیں۔ ہر انقلاب میں ایک تازہ زندگی کی توقع رکھتی ہیں اور نقل از مرگ خوف و ہراس سے کبھی داناؤں نہیں بچا تیں بلکہ رجائی (Optimistic) نظریہ کی حد سے زندگی کے آخری لمحوں میں بھی قسیمِ زیر لب قائم رہتا ہے۔ غالب نے اسی خاک کو بیان کیا ہے۔ ذیل کا یہ شعر بھی اسی مفہوم کا ہے۔

فقس میں مجھ سے رونا چہن کہتے نہ ڈر ہوم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشاں کیوں ہو

آسی صاحب نے آخراں اپنے مفہوم کی تائید میں ذیل کے یہ اشعار بھی پیش فرمائے ہیں:

ہفت اختر و چرخ خود آخر پہ چہ کارند

برق من این مریدہ با یار روا نیست

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
مریوں ہی تمام ہوتی ہے

حیرت ہے کہ اسی صاحب جیسے صاحب فکر و فہم نے ان اشعار کو غالب کے شعر کے ہم معنی بتایا ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آجی صاحب لکھتے ہیں: ”وہ لوگوں سے میری بیوقوفی اور عشق و غیرہ کا تذکرہ سن کر پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے اب ہمیں کوئی یہ بتائے کہ بتائیں کیا کہ غالب کون ہے۔ نعمت علی خاں عالی ایک جگہ لکھتے ہیں:

زمر و مہاروی پر سد کہ عالی کیست طالع میں
کہ عمر در محبت رفت و کار آخر رسید ایں جا

مگر غالب کے مصرعہ ثانی کا جواب نہیں ہے۔“

اس شعر کی بھی آجی صاحب نے نثر کر دی ہے وہ بھی صداقت سے دور ہے۔ آجی صاحب کا خیال ہے کہ معشوق خود عاشق سے نہیں بلکہ دوسروں سے پوچھتا ہے کہ غالب کون ہے اور جب اس کی خبر غالب کو ہوتی ہے تو غالب معشوق کی بے نیازی و تغافل پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہیں لیکن شعر میں سوال کرنے والا (وہ) معشوق ہے اور جواب دینے والا بلا شرکت غیر سے عاشق خود ہے۔ ضمیر متکلم واحد کی جگہ اکثر لوگ جمع کا صیغہ بولتے ہیں۔ غالب نے بھی یہی کیا ہے اور ”میں بتلاؤں کیا“ کی جگہ ضرورتاً شعری سے ”ہم بتلائیں کیا“ لکھا اور اس سے یہ کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ اس شعر میں عالی کے شعر کی طرح معشوق غیروں سے غالب کا حال پوچھتا ہے اور غالب اس تغافل پر انگشت بدنداں ہیں۔ عالی کا شعر غالب کے شعر سے بہت پست ہے۔ غالب کا شعر و اعلیٰ محاکات کا اعلیٰ نمونہ ہے اور چند آسان لفظوں میں جس طرح ایک داستان حسن و عشق نظم کر دی گئی ہے وہ غالب کی قوت تخیل اور قادر الکلامی کا کمال ہے۔ شعر کا مطلب صرف یہ ہے کہ غالب کی محبت اور اس کے معشوق کی رسوائی و بدنامی کا چرچا عام ہے۔ معشوق نے صرف اپنے عاشق کا نام سن رکھا ہے اور اس سے ششاسائی نہیں ہے اور اگر ششاسائی بھی ہے تو تھماہل بار فائدہ سے لوگوں سے پوچھتا رہتا ہے کہ غالب صاحب کون ہیں جو میری بدنامی اور رسوائی کا

سبب بنے ہوئے ہیں۔ ایک دن بالکل غیر کجھ کر یا انجان بن کر معشوق خود غالب ہی سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ غالب صاحب کون ہیں جو مجھ پر جان دیتے ہیں اور اس طرح خود کو اور مجھے بھی بدنام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر کوئی جواب نہ بن سکا ہوگا کیونکہ بقول مرثی

میاں حسن و محبت بیکار کیسے چناں
کہ درمیانِ ازاں مجھ حیا نمی سمجھ

اور معشوق کے درود و پاؤں جو انتہائی پیہاک اور حاضر جواب ہونے کے دماغ کا قتل ہو جانا، جواب دہی کی طاقت نکل ہو جانا اور غیرت عشق در صلبِ حسن و جمال سے زبان نہ نکلتا عشق کے حقیقی لوازم ہیں جن کا تعلق نفسیات سے ہے۔ اردو شاعری میں اس مفہوم کے متعدد شعر موجود ہیں۔ مومن کا ایک شعر بالکل اسی مفہوم کا ہے اور غالب کے شعرے سے بلند بھی لکھتے ہیں:

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
مجھ کو فکرِ جواب نے مارا

میر لکھتے ہیں:

کہتے تھے اس سے ملنے تو کیا کیا نہ کہنے لگ
وہ آگے تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

معشوقی کہتے ہیں:

دل میں کہتے تھے پیارو یکم اس سے کہیں
مل گیا وہ تو نہ اک حرفِ زباں سے نکلا

جرات فرماتے ہیں:

بعد آرزو جو وہ آیا تو یہ تھاپ عشق سے حال تھا
کہ ہزار دل میں تھیں حسرتیں اور اٹھانا آنکھ بحال تھا

فانی کہتے ہیں:

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہیں
تہ چپ ہیں کہ کیا کہیں کھٹکی ہے زباں کوئی

خود غالب نے بھی اسی خیال کو اس طرح ظہور کیا ہے:

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پرو کیسے کیا کہتے ہیں

— — —

موت کا ایک دن مضمّن ہے
خیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آسی صاحب فرماتے ہیں: ”موت تو یوں نہیں آتی کہ اس کا ایک وقت مقرر ہے اور اپنے وقت
معیّن پر آئے گی مگر خیند کو آنے میں کیا عذر سے وہ رات بھر کیوں نہیں آتی یا یہ کہ موت تو اپنے وقت
پر آ کر رہے گی آخر خیند اس کی فکر میں کیوں نہیں آتی۔“

آسی صاحب نے خیند نہ آنے اور موت نہ آنے کے الگ الگ منطقی تجربے کئے ہیں اور
ان میں کسی قسم کے دہکا کا اظہار نہیں ہے گویا عاشق شدت غم و آلام سے موت اور خیند دونوں کا
طالب تھا جب دونوں میں سے ایک بھی نہ آ سکی تو حیرت سے کہتا ہے موت تو اپنے معیّن پر آئے
گی آخر خیند کیوں نہیں آتی لیکن جب کشمکش زندگی کا یہ عالم ہے کہ موت کو نہ صرف زندگی پر ترجیح
دی جا رہی ہے بلکہ آلام سے نجات کی خاطر موت کی دعا مانگی جا رہی ہے تو پھر رات بھر خیند نہ آنے
پر حیرت و استعجاب کیسا؟ پریشانی میں خیند تو حرام ہو ہی جاتی ہے اس طرح آسی صاحب کے بیان
کئے ہوئے معنی بے معنی ہو جاتے ہیں، آخر میں آسی صاحب نے تھکنک کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ
موت تو اپنے وقت پر آ کر رہے گی، خیند اس کی فکر میں کیوں نہیں آتی۔“

اس جگہ بھی مولانا نے صرف شعر کی سنز کر دی ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر کبھی کشمکش حیات
میں موت کا خوف انسان کے دل میں پیدا ہوا تو خیند آز جاتی ہے لیکن ایک حوصلہ مند اور بلند
کردار انسان اس حقیقت کو مد نظر رکھ کر موت تو برحق ہے وہ اپنے وقت پر آ کر رہے گی اس کا
خطرہ ہر وقت محسوس کرنا بیکار ہے۔ موت کے خوف کو دل سے نکال دیتا ہے لیکن اس کے باوجود
جب خیند نہیں آتی تو اسے اپنی پریشانی و غلطی کا راز کچھ میں نہیں آتا اور حیرت سے کہتا ہے کہ
صرف موت ایسی چیز ہے جس کے خوف سے خیند آز جاتی ہے۔ مجھ پہ موت کا خوف طاری نہیں

اس لئے کہ میں جانتا ہوں :

”موت کا ایک دن معین ہے، آخر پھر غیہ کیوں رات بھر نہیں آتی۔“ دوسرے مصرعہ میں سوزِ محبت و تپشِ عشق کی جس نئی کیفیت کو اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس سے مذاقی تسلیم ہی کیف و حظ اٹھا سکتا ہے اور جس دحر و تجاہلِ عارفانہ سے ”غیہ کیوں رات بھر نہیں آتی“ کا استعجابی استفسار قائم کیا گیا ہے اس کی مثالیں اُردو شاعری میں کم ملیں گی۔

چلا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز را کے ساتھ

پچھاتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آسی صاحب لکھتے ہیں:- ”میں تلاشِ منزل مقصود میں سرگرداں اور دیوانہ ہو رہا ہوں اور اجتہادِ دلالت کی یہ ہے کہ اپنے راہبر کو بھی نہیں پچھاتا کہ کون مجھ کو اپنی منزل تک پہنچا دے گا۔ اس دیوانگی میں جس راہبر کو تیز جاتا دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے اور اُسے بھی میری طرح جلد یہ سوچنے کے لئے مضطرب ہے۔ بس اس خیال کی بنا پر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ جب دیکھتا ہوں کہ وہ کبھی دوسری جگہ جا رہا ہے اور اس کی منزل اور ہے تو پلٹ آتا ہوں کوئی اور چیز روکتا ہے پھر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ یہ شعر کو یہ تصویر دیوانگی ہے اور محاکاتِ شاعری اسی کا نام ہے۔“ آسی صاحب نے تھوڑی دیر ہر ایک کے ساتھ چلنے اور راہبر کو نہ پچھاننے کی وجہ دیوانگی قرار دے کر شعر کو تصویرِ دیوانی کہہ دیا ہے حالانکہ شعر کے کسی لفظ سے بھی ذہن دیوانگی کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ غالب تو صرف ایک عاصیِ کلید کی نفسیاتی تحلیل کر رہا ہے اور شعر میں اس محاکاتِ داخلی کا رنگ چڑھا رہا ہے جو واقعہ پر قائم ہے۔ قاعدۂ عالم یہ ہے کہ جب کسی علم و فن کا مبتدی اس علم و فن کے تمام رموز و نکات سے بہرہ ور نہیں ہوتا تو وہ ہر اس شخص کا معتقد و مداح ہو جاتا ہے جو اس سے زیادہ دستِ گاہ و آگاہی رکھتا ہے۔ لیکن جب اس شخص سے بھی زیادہ جرمند آدمی نظر آ جاتا ہے تو پہلے آدمی کی وقعت خود بخود اس کی نگاہ میں کم ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے کی تقلید و تائید میں لگ جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک وہ خود اس علم و فن کے تمام مدارج

طے کر کے کمال کو نہیں پہنچ جاتا یا اس میں راہبر کے انتخاب کی پوری صلاحیت نہیں پیدا ہو جاتی۔ اسی کھلیے کو غالب نے بیان کیا ہے اور تھوڑی دیر راہبر کے ساتھ چلنے یا راہبر کو نہ پہچاننے کی وجہ خود مقلد کی نا تجربہ کاری اور کوتاہ علمی ہے جو عین فطرت کے مطابق ہے مولانا حالی نے بھی عشق حقیقی کی رنگ میں اس شعر کا مطلب اسی انداز میں بیان فرمایا ہے اور انھوں نے دیوانگی کا تذکرہ کہیں نہیں کیا۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم

میرا سلام کہج اگر نامہ بر طے

آسی صاحب لکھتے ہیں۔ "اے ندیم خیر تجھ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر اتنا کہ اگر کہیں نامہ بر طے تو ذرا ہمارا سلام کہنا کہ واہ خوب ہمارے خط کا جواب لائے۔" ظاہر ہے کہ یہ شعر کا مطلب نہیں ہے صرف نثر ہے دوسرے یہ کہ "سلام کہج" میں طرک کا پہلو ہے لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا ہوتا کہ "خوب ہمارے خط کا جواب لائے" کا مد جواب لانے کا مددگار نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ مکتوب الیہ کو کوئی جواب نہ دے اور وہ خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس کا کام مخطوط سپردہ کو لانا اور لے جانا ہے وہ کسی کو جواب دینے یا نہ دینے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ لہذا آسی صاحب کا فرمودہ مطلب صحیح نہیں مظلوم ہوتا۔ ڈاکٹر بجنوری، نظم طلباء بانی اور حسرت کی شرحیں آسی صاحب کے سامنے تھیں پھر بھی خدا جانے کیوں صحیح اور قرین قیاس مضمون سے گریز کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں مرزا غالب نے خود بھی اپنے ایک خط میں اس شعر کا مفہوم یوں بیان فرمایا ہے: "شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھڑکایہ کہ کہیں قاصد معشوق پر عاشق نہ ہو جائے۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعیت اور معتدالیہ ہے ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا اقتضار عاشق کا گمان صحیح ہوا۔۔۔۔۔ عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ہے۔ اے ندیم تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر طے تو اس سے میرا سلام کہج کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔" خود صاحب شعر کی وضاحت کی موجودگی میں آسی صاحب کی

ذاتی مطلب نگاری عجیب و غریب ہے۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

آسی صاحب لکھتے ہیں: ”جب تک قاصد واپس آئے میں ایک خط اور لکھ رکھوں کیونکہ وہ جو کچھ لکھیں گے مجھے معلوم ہے۔۔۔ جو وہ لکھیں گے جواب میں، میں نے بہت سے معافی پیدا کر دئے ہیں جس سے اسنے پہلو نکلتے ہیں۔ انکار و صل جو ان کی عادت ہے اس مرتبہ بھی لکھیں گے۔“ آسی صاحب کا بیان کردہ مفہوم کسی حد تک درست ہے لیکن میرے نزدیک ”میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں“ کا دعویٰ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ عاشق کو مستحق کے دل کی حالت فی الواقع معلوم ہے اور ان دونوں کو بہ فیض عشق ایک دوسرے کے دل کی خبر اسی طرح رہتی ہے جیسے خود اپنے دل کی اور اسی لئے عاشق پہلے خط کے جواب کا انتظار نہ کر کے اور آنے والے جواب کو خود تک پہنچنے سے پہلے ہی دوسرا خط لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس مفہوم کی تائید غالب کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نگار، جولائی ۱۹۵۴ء

نقش ہائے رنگ رنگ

مذکورہ بالا عنوان کے تحت، شاہ حسن عطا صاحب کا مضمون اگست کے ”کتابی دنیا“ میں شائع ہوا ہے موصوف نے غالب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے اس شعر کو فارسی میں تاجہ جنی نقشہائے رنگ رنگ
ہگذر از مجموعہٴ اردو کہ بے رنگِ منصف

عالم و عامی، دونوں نے بار بار پڑھا اور سنا سنایا ہے اور میری ناچیز رائے میں صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ عام طور پر لوگ شعر کو غالب کے فارسی اور اردو کلام کے موازنہ کے موقع پر پڑھتے ہیں اور ان کا طرز استدلال یہ ہوتا ہے کہ غالب کا فارسی کلام تو عبقریت اور شعر گوئی کے کمال پر دل ہے مگر ان کا اردو کلام معمولی و رچکا ہے۔“

اس عبارت کے آخری حصے کو دراصل یوں ہونا چاہیے تھا کہ غالب کے نزدیک ان کا فارسی کلام تو ان کی ذہانت، عبقریت اور شعر گوئی کے کمال پر دل ہے، مگر ان کا اردو کلام معمولی۔ اس لئے کہ لوگ غالب کے اس شعر کو استدلال کے طور پر نہیں بلکہ غالب کے دعوے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور شعر کا اصل مفہوم ہے کہ غالب اپنے فارسی کلام کو اردو سے بہتر سمجھتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے علاوہ اس شعر کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔ شاہ حسن عطا صاحب نے سر عبد القادر اور دوسرے علماء وادباء کی شعر جمعی پر اس سلسلے میں بے جا طنز کیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے واضح طور پر فارسی کو اردو پر ترجیح دی ہے اور کھینچ جان کر بھی کوئی شخص اس کا مفہوم نہیں بدل سکتا۔ اس لئے حسن عطا صاحب کا یہ اعلان کہ

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

عجب کی بات ہے۔

حسن عطا صاحب نے اس سلسلہ میں "بے رنگ" کے لغوی معنی پر بھی بحث کی ہے اور اپنی دانت میں نئے معنی وضع کرنا لے ہیں چنانچہ وہ Dictionary of Persian Language کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"بے رنگ" کا مطلب خاکہ یا نقشہ ہے اور انگریزی میں اس کے

مقابل Sketch کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔"

یہ کوئی ایسے معنی نہیں جو فارسی کے دوسرے لغات سے الگ ہوں۔ غیاث اللغات، سراج اللغات اور بہارِ نجم میں بھی معنی دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن اسے اصلاً ایک لفظ یعنی مفرد خیال کرنا غلطی ہوگی۔ یہ "بے" اور "رنگ" سے مرکب ہے اور ایسے خاکے کو کہیں گے جس میں رنگ نہ بھرا گیا ہو۔ خاکہ یا Sketch بھی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رنگ آمیز نہیں سادہ ہو بہارِ نجم میں بے رنگ کے معنوں میں لکھا ہے "موند کہ پیش از بنائے عمارت کھنڈ و بعض نقشہ تصویر کہ ہنوز در اس رنگ آمیزی نہ کردہ باش"۔ "بے رنگ" کے ان لغوی معنی کو ذہن رکھ کر غور کیجئے تو فارسی کلام کو "رنگ" اور اردو کلام کو "بے رنگ" کہنے کا اس کے سوا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔ غالب اپنے فارسی کلام کو اردو کلام سے بہتر خیال کرتے تھے۔ غالباً حسن عطا صاحب کو اس شعر کے معنی میں مغالطہ اس لئے ہوا کہ انھوں نے پہلے مصرع میں لفظ ہیں اور دوسرے میں "چند" نظر انداز کر دیا ہے۔ ورنہ یہ دونوں لفظ اردو اور فارسی کلام کے موازنہ کا اتحاد واضح کر دیتے ہیں کہ اس مغالطے کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہتی۔ شاہ صاحب "بے رنگ" کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں:

"گویا اس شعر کا یہ مطلب ہوا، میرا اردو کلام میری شاعری کا محض ایک خاکہ ہے ایک نقشہ ہے جسے میں نے مرتب کیا ہے اور میری فارسی شاعری دیکھنے سے البتہ ان رنگارنگ نقوش کا صحیح شعور پیدا ہوگا جو میں نے اس خاکے میں بھرے ہیں۔ اس شعر سے غالب کے اس تفاخر کا تو اظہار الگ ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی فارسی شاعری پر اٹھتے بیٹھتے کیا ہے مگر یہ شعر ان کے اردو کلام کی حقیقت و سچائی پر گواہ نہیں۔"

یہاں "حقیقت و سچائی" کے الفاظ زائد ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اردو اور فارسی کلام کا موازنہ کرنے اور فارسی کے متعلق نہیں "اور اردو کے بارے" "چند" کا حکم لگانے کا منطقی نتیجہ کیا اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے کہ غالب اپنے اردو کلام کو فارسی کلام سے گھٹا خیال کرتے تھے۔

شاہ حسن عطا صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ غالب فارسی میں اعلیٰ زبان کے مقلد تھے اس لئے وہ یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فارسی کلام اردو سے بہتر ہے یہ ایک الگ بحث ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ غالب نہایت سنجیدگی سے اپنی اردو نظم و نثر کو فارسی نثر و نظم سے کم تر سمجھتے تھے۔ ایک جگہ نہیں ہزار جگہ نہایت واضح طور پر انھوں نے اس کا اعلان کیا ہے۔ اب آپ اسے ان کا احساس کمتری کہیے یا احساس برتری، نسلی تعصبات کا نتیجہ سمجھئے یا غلامانہ ماحول کا اثر خیال کیجئے، لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انھوں نے فارسی ہی کو اپنے لئے معیارِ سخن قرار دیا اور اردو کو فارسی کے مقابلے میں آخری دم تک کم مایہ خیال کرتے تھے۔ ان کے فارسی کلام میں ایک دو نہیں سیکھڑوں اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں انھوں نے اپنی فارسی دانی و فارسی گوئی پر فخر و ناز کا اظہار کیا ہے۔

اوپر جو شعر زیر بحث آیا ہے اس میں تو واضح طور پر اردو سے فارسی کو کم تر دیکھ دیا گیا ہے۔ جس فارسی قطعہ کے یہ اشعار ہیں اگر حسن عطا صاحب پڑھ لیتے تو مغالطے کا شکار نہ ہوتے۔ اس شعر سے پہلے کے چند اشعار دیکھئے:

اے کہ در بزم شہنشاہِ سخن رس گلشنہ ای
کہ چرمگوئی فلاں در شعر ہمگیب منست
راست گفتی یک میدانِی کہ خود جائے طعن
کم تر از باغِکِ دہل، کر نغمہ چنگ منست
نیمست نقصان یک دو جزو ست از سوار بخند
کاں و زم بر گے ز نخلستانِ فرہنگ منست
فارسی نہیں تابہ بینی نقشبائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ منست

بعد کے اشعار کا بھی یہی انداز ہے اور صاف چتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی کو اردو پر بالا اعلان ترجیح دے رہے ہیں۔ دو تین شعر دیکھئے:

فارسی میں تا بدائی کا اندر اعلیم خیال
مانی و اردو نگم و آں نسو از رنگ منست

کہ درخشد جو ہر آئینہ تابا قیست زنگ
 صقلے آئینہ ام ایں جو ہر آں زنگ منست
 راست می گویم من و از راست سر قواں کشید
 ہر چہ در گفتار فخر تست آں جگ منست

انھیں اشعار پر مخلص نہیں، اکثر جب انھوں نے خود کو غیر معمولی فارسی دہاں اور فارسی گو کہا ہے۔ نظم ہی نہیں نثر میں بھی اس قسم کے بیانات یا دعوے ملتے ہیں۔ نواب صاحب باندہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

”عرصہ سے رنجت نہیں کہتا صرف فارسی میں غزل سرائی کرتا ہوں لیکن خلل اللہ کا
 فضا یہ ہے اس لئے کبھی کبھی کہہ لیتا ہوں۔“

جب اسٹورٹ ریڈ صاحب نے اردو قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تو فشی شیونرائن کو مختلف خطوط میں لکھا:

”اردو میں اپنا کمال کیسے ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گفتگو نیشن عبارت آرائی کہاں
 ہے؟ میں اردو میں کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ سے اردو کی فرمائش ہو۔“

”بھائی تم غور کرو، اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں
 معافی نازک کیوں کر بھروں گا۔“

کیا یہاں فارسی کے مقابلے میں غالب نے اردو کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ضرور دیکھا۔
 فارسی نثر اور اردو نثر کے باب میں بھی وہ کبھی غلط نظر رکھتے تھے۔ آخری بیس سال کے سوا
 عمر بھر خطوط فارسی میں لکھتے رہے اور نثر کے متعلق ان کا یہ دعویٰ:

”میں نے دو اعداد از تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کو س سے بہ
 زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے حزمے لیا کرو۔“

بہت بعد کا ہے ورنہ ابتداً جب ان سے فشی شیونرائن نے ان خطوں کو شائع کرنے کی اجازت چاہی
 تو جواب میں لکھا:

”اس کی شہرت میری جن دوری کے منائی ہے۔ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔“

کیا ان قصیدہ جات کے بعد بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب، اردو نظم و نثر کو، فارسی نظم و نثر کے مقابلے
 میں حقیر یا کم تر خیال نہیں کرتے تھے؟

شاہ حسن عطا صاحب اہل نظر میں سے ہیں۔ غالب کی پوری زندگی اور کلام ان کے سامنے ہے اور انھیں خبر ہے کہ تیس برس کی عمر کے بعد سے غالب کی زیادہ توجہ فارسی ہی کی طرف رہی۔ وہ عموماً کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت اردو کی طرف رجوع ہوتے تھے کیوں! صرف اس لئے کہ انھیں فارسی دانی کا غرہ تھا اور اردو ان کے نزدیک کم مایہ تھی۔

حسن عطا صاحب نے اردو میں خط لکھنے کے سلسلے میں غالب کے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ بھی مغالطہ آمیز ہے۔ یہ خط ان کی اُس عمر کا ہے جبکہ وہ مجبوراً اردو میں خط لکھتے تھے۔ انھوں نے کہ شاہ صاحب نے سیاق و سباق کو محذوف کر کے اپنے کام کی سطر میں اس میں نقل کری ہیں ورنہ اگر وہ یہ سطر بھی:

”بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ بیرازہ سری و ضعیف کے صدموں سے محنت چڑھی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیز کی کوزہ ال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قوی غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں“

اس خط سے نقل کر دیتے تو بات صاف ہو جاتی اور شاہ حسن عطا صاحب اس نتیجہ پر ہرگز نہ پہنچتے کہ اس خط میں غالب اردو کو فارسی پر ترجیح دے رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ غالب نے اپنی فارسی دانی یا فارسی نظم و نثر کو اردو نظم و نثر پر ترجیح کے جو دعوے کئے ہیں وہ کس حد تک درست ہیں۔ سو یہ الگ بحث ہے اور اس سلسلے میں بھی دور انھیں نہیں ہیں۔ سب کو ان کے دعوؤں پر بارہ سنگسار کی کہانی یاد آتی ہے کہ غالب جس چیز کو حقیر اور اپنی شہرت یا مرتبے کے متافی سمجھتے تھے وہی ان کی عظمت و شہرت کا اصل سبب بن گئی اور فارسی نظم و نثر پیچھے رہ گئی۔

ع انقلابات ہیں زمانے کے

ٹکار پاکستان، مارچ ۱۹۵۳ء

غالب کی اردو رباعیاں اور ان کی تاریخی و تنقیدی اہمیت

غالب کی غزل اور مثنویات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اردو رباعیات بہت کم زیر بحث آئی ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غالب کے اردو دیوان میں، رباعیوں کی تعداد دوسرے بڑے شعرا خصوصاً غالب کے معاصرین کے مقابلے میں بہت کم ہے یعنی صرف سولہ۔ پھر بھی ان سولہ میں سے متعدد ذیل تین رباعیاں غالب کے ارتقائے فکر و فن کے سلسلے میں اکثر زیر بحث آئی ہیں اور ان سے غالب کے بعض اہم فنی و تاریخی مقدمات کے حل میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۱)

بعد از اتمام بزم عید الخفایں
ایام جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پینچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال

(۲)

ڈکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل ڈک ڈک کر بند ہو گیا ہے غالب

والہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
 سوتا سوگند ہو گیا ہے غالب
 (۳)

مشکل ہے زبیں کلام میرا اے دل
 سن سن کے اُسے سخنورانی کمال
 آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
 کویم مشکل و کرنہ کویم مشکل

پہلی زبانی نے بیاض غالب بخط غالب (نسخہ امروہہ) مطبوعہ نقوش، لاہور ۱۹۶۹ء اور
 ”ذیو الہنا غالب خط غالب“ نسخہ سرشی زبورہ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء کے بارے میں یہ گزارش کیا کہ یہ
 جعلی ہیں۔ ہر چند کہ خطی نسخہ ایک ہی تھا اور اسے یوجوہ طباعت کے وقت دونوں نام دیے گئے اور
 اس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ بخط غالب ہے اور ۱۳۳۱ھ کا مکتوبہ ہے جب کہ غالب کی عمر
 زیادہ سے زیادہ صرف ۱۹ سال تھی۔ اس نسخے کے جعلی ہونے کے سلسلے میں مجھ سمیت بہت سے
 اہل نظر نے شواہد دیے لیکن یہ بات بہت دنوں تک تسلیم نہیں کی گئی آخر کار کمال احمد صدیقی نے
 یہ کمال محنت اس کے جعلی ہونے کے بارے میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب لکھی۔ یہ
 کتاب ”بیاض غالب“ حقیقی جائزہ کے زیر عنوان ”ادارۃ مطالعات غالب“ سری نگر کشمیر سے،
 مذکورہ بالا خطی نسخوں کی اشاعت کے فوراً بعد جلد شائع ہوئی۔ پہلی بار صرف ایک سو کی تعداد میں
 تپسی تھی قیمت پانچ سو روپے تھی، اس کا ایک نسخہ راقم الحروف کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

غالب کے مذکورہ بالا خطی نسخے میں غالب کی وہ زبانی موجود ہے جس کا ذکر اوپر آیا لیکن
 اس زبانی کے مطابق الفاظ صاف جتا رہے ہیں کہ یہ ۱۹ سال کی عمر کی نہیں بلکہ اس وقت کی تخلیق
 ہے جب کہ غالب طفلی و جوانی کی منزلوں سے بہت آگے بڑھ کر ”سواہر اقلیم عدم“ یعنی بیرون سالی
 کی آخری حدود میں داخل ہو گئے تھے۔

دوسری زبانی نے تنقید خصوصاً عروضی تنقید کی ایک طویل بحث کو ختم دیا یہ بحث ماہنامہ نگار
 (نکستہ) کے صفحات میں بھی زیر بحث آئی ہے اور اس میں علامہ نیاز فتح پوری سمیت، بہتوں نے
 حصہ لیا ہے۔ غالب سب سے پہلے اس پر نظم طباطبائی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اس کا دوسرا مصرعہ:
 دل زک زک کر بند ہو گیا ہے غالب

کہا جی کے وزن سے خارج ہے اور اس میں ایک ”ذک“ بد وزن فتح زائد ہے۔ بعض نے اسے کتابت کی غلطی بتایا اور مصرعے کی صحت یوں کر دی کہ:

”دل ذک کر بند ہو گیا ہے غالب“

لیکن اس طرح مصرعہ مکمل ہو جاتا ہے، ”ذک کر بند ہو گیا“ ہے اور ”ذک ذک کر بند ہو گیا ہے“ معنوی اعتبار سے دونوں الگ الگ باتیں ہیں اور ایک ”ذک“ کے خارج کرنے سے شعر کا مفہوم لایا جی ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں دیوان غالب کے سارے قدیم و جدید نسخوں میں ”ذک ذک کر“ درج ہے حتیٰ کہ ایسے نسخوں میں بھی جو غالب کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے کتابت کی غلطی کہنا درست نہ ہوگا، غالب سے چوک ہو گئی ہے اور انھوں نے رباعی کے دوسرے مصرعے کو وزن سے خارج ہی نظم کیا ہے۔ بایں ہمہ اس سے غالب کے شاعرانہ مرتبے یا ان کی عروض دانی پر حرف نہیں آتا۔ رباعی کا وزن ایک مشکل وزن ہے اور اس کو مرتبے میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگاتے ہیں، غالب سے بھی ایک جگہ نادانستہ لغزش ہو گئی۔ تیسری رباعی کی بھی ایک الگ داستان ہے، اس کا چوتھا مصرعہ:

”گویم مشکل دگر نہ گویم مشکل“

جسے قاری ضرب المثل کہنا چاہے۔ غالب کے ہم مصرع شاعروں کے ان تنقیدی و تحقیقی ردیوں کو سمیٹے ہوئے ہے جو غالب کی شاعری کو مکمل کہہ کر سرمفل ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ غالب نے اس طرح کے معترضین کو اپنے اشعار کے ذریعے اور مقامات پر بھی جوابات دیئے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں:

مگر خامشی سے قائمہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ مری بات سمجھنا محال ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
مگر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بک رہا ہوں جنوں میں، کیا کیا کچھ
کچھ نہ مجھے خدا کرے کوئی

لیکن زیر نظر رباعی کا ایک خاص پس منظر ہے، حکیم آغا جان پیش دہلی کے نامور شاعر تھے اور غالب و مومن کے ہم عصر دل میں تھے، اور غالب کی مشکل پسندی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی چنانچہ ایک دن بھری محفل میں انھوں نے غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا یہ قطع سنایا جو آپ حیات میں نقل ہوا ہے:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی مجھے تو کیا مجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا مجھے
کلام میر مجھے اور زبان میرزا مجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا مجھے

غالب یا شعارسن کر تھلا گئے ہوں گے چنانچہ انھوں نے اُن کے جواب میں یہ رباعی کہی کہ:

مشکل ہے زبں کلام میرا اسے دل
سُن سُن کر اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و مگر نہ گویم مشکل

لیکن رباعی کے یہ مصرعے ابتدا اس طور نہ تھے بلکہ غالب نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا تھا اور اس کی صورت یوں تھی کہ:

مشکل ہے زبں کلام میرا اسے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کر چاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و مگر نہ گویم مشکل

بعد کو غالب نے اس کا دوسرا مصرعہ قریبی دوستوں کے کہنے سے بدل دیا تاکہ رباعی ٹھٹھ محفل میں سنانے کے لائق رہے اور کسی کی دل آزاری کا وسیلہ نہ بنے۔

مختصر یہ کہ غالب کی اردو رباعیات کی تعداد بہت کم ہے بایں ہر غالب کے سوانح اور تحقیق و تنقید میں اُن کا بار بار ذکر آیا ہے اور یہ ذکر ثابت کرتا ہے کہ غالب کی رباعیاں تعداد میں کم ہیں لیکن معیار شعر اور معیار نقد و تحقیق غالب کے باب میں اُن کی خاص اہمیت ہے۔

”غالب: شاعر امروز و فردا“

غالب کی سویریں برسی گز رہی ہیں اس کی آمد آمد کے ساتھ علم و ادب کی دنیا میں جو لہجہ پیدا ہوئی تھی، اس کا زور اب تک نہیں تھا۔ تحقیق و تنقید نے اس عظیم انسان اور عظیم شاعر کی عظمت کے اعتراف کے جو منصوبے بنائے تھے، ان کی تکمیل کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد غالب پر کوئی نہ کوئی تحقیقی، تنقیدی یا ملی جلی تحقیقی و تنقیدی کتاب شائع ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید کا یہ صدقہ جاریہ یوں ہی جاری رہے گا اور خدا کرے کہ جاری رہے کہ غالب کے فکر و فن کی تازگی اور پختگی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

اس صدقہ جاریہ کی تازہ ترین صورت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین کا مجموعہ ”غالب: شاعر امروز و فردا“ ہے۔ اس مجموعے میں چندرہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں غالب کی شخصیت اور شاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھا، جانچا اور پرکھا گیا ہے اور فن اور فنکار دونوں کی ایسی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے خدو خال موزوں اور متناسب ہوں اور رنگ و آہنگ دل آویز اور جاذب نظر۔ یہ منصب جس سلیقے اور انداز سے ادا کیا گیا ہے، اس میں ہر جگہ تازگی و پختگی ہے اور چڑھنے والا ہر مضمون پڑھ کر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ غالب کے کلام کا مرتبہ و مقام یہ ہے کہ اس میں اب بھی تاویل و توجہ کے نئے نئے ذرائع نکل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ غالب کے ساتھ محقق، مبصر اور نقاد کا چنی اور جذباتی تعلق، زندگی بھر کی رفاقت، و مسازی، خلوص اور یکا گت کا نتیجہ ہو۔ یہ سب مضامین بقول مصنف، غالب کی ہشت پہلو ذات، جامع الصفات شخصیت، صدر نگ فن اور جزار شیوہ ادبیت کی وکالت اور وضاحت کی غرض سے لکھے گئے ہیں اور تحقیق نے منطق کی خوش استدلالی اور تنقید نے فلسفے کی خوش فکری کی مدد سے محقق اور نقاد کی راہ کو آسان بنایا ہے۔

غالب کے اولین تعارف نگار، غالب اور غالب تخلص کے اردو شعراء، غالب کے حالات میں پہلا مضمون، غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز، اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی اور، غالب اور اقبال، غالب نمونہ حمید یہ کی روشنی میں اور غالب، شاعر امروز و فردا، نیم تحقیقی نیم تنقیدی یا طے جیسے تحقیقی و تنقیدی مضمون ہیں۔ ان مضامین کی بنیادی خصوصیت، میں نے منطقی خوش استدلالی کو بتایا ہے اور منطق میں خوش استدلالی کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ آپ کی طرح میں بھی سیاست دانوں، وکیلوں، واعظوں اور مناظروں کے ہاتھوں منطق کی روایتی زیوں حالی کے افسانے سن چکا ہوں۔ سوطر ز استدلال نے زندگی کے ہر دور میں منطق کو الجھاوے ڈالنے اور مغالطے پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ منطقی مغالطوں کی جامہ دہی سے محققوں کے دامن بھی محفوظ نہیں، اس لیے تھک نظری اور سبک سری کو نیند ہی ان مغالطوں کی جھاوے میں آتی ہے۔ لہذا منطق، خوش استدلال نہیں تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی، صحیح اور دیانت دارانہ تحقیق کا راستہ ہی خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات، ان سب مضامین میں بدرجہ اتم موجود ہے جن کے نام، میں نے ابھی لیے۔

فرمان صاحب، بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں۔ اس دعوے کی صداقت کے اثبات میں صاف، سیدھے اور واضح صغریٰ اور کبریٰ کی قائم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریح نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقدمہ بنتا ہے اور صغریٰ و کبریٰ کی ایک نئی ترتیب، کسی اور نتیجے کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہے۔ مقدمات، مفروضات، ملکت اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس، استخراج، استقراء، استنباط اور استخراج کے کئی مرحلوں سے گزرتی ہوئی، یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔ فرمان صاحب کے تحقیقی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی ہیں جنہیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔ منطق کے جن مرحلوں کا ذکر میں نے ابھی ان تحقیقی مضامین کے حوالے سے کیا، ان میں بڑی سبک رفتاری سے ابھرنے اور آگے بڑھنے والی مثال کی کیفیت ہے جو شوق اور تجسس کو ابھارتی، ذہن کو شک و یقین کے زیر و بم سے گزارتی ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو ہر پڑھنے والے کے لیے قابل قبول ہو۔ منطقی استدلال کا ایک اور وصف جو ان سارے مضامین میں جاری و ساری ہے، اس کے لیے کی ایسی محتانت اور نرد و باری ہے جس نے غلط روی اور دل داری کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دمساز بنایا ہے۔ اس تحقیق نے دیانت دارانہ اور محبت آمیز

وکالت کو اپنا وظیفہ بنایا اور ہمیشہ خوش بیانی سے اسے پورا کیا ہے۔

مجموعے کے تنقیدی مضامین میں ہدیکی طور پر تازگی، تحقیقی اور خوش بیانی کا وصف اس سے بھی زیادہ ہے جتنا تحقیقی مضامین میں اور اس کی وجہ نکلا ہر ہے۔ تحقیقی مضامین جس طرز استدلال کا مطالبہ کرتے ہیں، اس میں وقتی عمل کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں تہرے اور تحسین کے مرحلے، دل کی راہ سے ملے ہوتے ہیں اور یہی فرق، تازگی، تحقیقی اور خوش بیانی کے مدارج میں فرق پیدا کرتا ہے۔

غالب کے کلام سے اپنی ذاتی اور نفسی رشتے کا ذکر کرتے ہوئے فرمان صاحب نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا کہ وہ غالب کی:

”نہوت شعری پر ایمان رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر مرحلے پر

اسے اپنا رہنما اور مشکل کشا سمجھتے رہے ہیں۔“

شاعر اور اس کے قاری کے باہم تعلق اور رشتے کی نوعیت اس حد تک جذباتی ہو کہ وہ اس کا پرستار بن جائے تو تعریف و توصیف میں اسے غلو اور اغراق کی حدوں سے گزر جائے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ کسی کو اس سے، اس کا یہ حق چھیننے کا اختیار نہیں۔ یہ اس کے دل کا معاملہ ہے اور دل کی شریعت اس خاص معاملے میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ چون و چرا کے جائزگیر ضابطے یہاں استعمال نہیں کیے جاتے۔ یہ سب کچھ درست، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل کے معاملے والی بات، ہوتی بڑی عالم ہے۔ اسے چھپا کر کہیے تو دل ناسور بن جاتا ہے اور اسی لیے آدمی ہر قانون قدرت کا جبر ہے کہ وہ دل کی بات کو باہر نکالے اور ساری دنیا کو اپنے درد کا ساتھی بنائے، یوں کہ دنیا اس کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے اور احساس میں سنن و تو کا فرق اور امتیاز باقی نہ رہے۔ جھگڑا نہیں سے شروع ہوتا ہے اور کیوں اور کیسے کے تیروں کی بو چھاڑ سے کلیجہ پھٹتی ہوئے لگتا ہے۔ دل کے باہر کی دنیا تعریف و توصیف کے اسباب جاننا چاہتی ہے اور اپنے درد کو دنیا کا درد بنانے کی آرزو رکھنے والا انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر وکالت شروع کرتا ہے۔

اس وکالت کا پہلا مرحلہ محاسبہ نفس ہے، یعنی اس بات کی جانچ، پرکھ اور تلاش کہ میں کسی کے شخص کا پرستار اور فریفت کیوں بن گیا؟ جس دل والے کو اس بات کا صحیح جواب مل جائے، وہ غلو ہے اور جو غلو اس صحیح بات کو لفظوں کی حد سے دوسروں کے دل میں اتار سکے، وہ اچھا غلو۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کی محبت، ہمنگی اور پرستاری کا داخلی سفر انہیں مرحلوں سے گزر کر

طے کیا ہے اور ان کی سلاحتی طبع نے ٹخن بیان کو اپنا رفیق بنا کر اپنے محسوسات کی پوری دنیا کو، دوسروں کے محسوسات کی دنیا تک پہنچا دینے کا معرکہ سر کیا ہے۔ غالب کے کلام کے مطالعے سے قاری جن جن نازک تجربات میں سے گزرتا ہے انہیں اور اک سے اعتبار میں غفلت کرنے کی سعادت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بلاشبہ فرمان فتح پوری کی تنقید اس قاطب رشک معلومات کی حصہ دار ہے۔

فرمان صاحب نے غالب کو شاعر امروز و فردا کہہ کر محض حسین دہ صیف کا رکی فریضہ ادا نہیں کیا۔ ان کی تحقیق اور تنقید روایتی آداب و رسوم کو محترم سمجھنے اور ان کی پیروی اور پابندی کرنے کے معاملے میں بڑی تہ امت پسند ہے لیکن تہ امت پسندی کے اس سلطان کو انہوں نے سوچ سمجھ کر اور اس سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہو کر اختیار کیا ہے۔ کسی شاعر کو بے یک وقت شاعر امروز و فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیانی فصل و بعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانون فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ یہ جتنی تیز، جتنی دور میں اور جتنی دور رس ہوگی، اسی حد تک شاعر کے فکر و خیال اور جذبے میں رسائی کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جس کی بدولت وقت کی ملتانیں کھینچ کر ماضی، حال اور مستقبل کو ایک نقطے پر لے آتی ہیں۔ آج کا شاعر ہر دور کے انسان کے جذبے کا ترجمان بن جاتا ہے اور اس کی شاعری میں ہر دور کے انسان کے احساس کی آئینہ کا وصف پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے معانی کی جہیں یوں کھلتی ہیں کہ ہر انسان انفرادی طور پر اور ہر عہد پر حیثیت مجموعی ان میں اپنی محرومی، اپنے غم، اپنی آرزو اور اپنے عزم کی تصویریں دیکھتا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعر امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کو احساس اور دھوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

بالکل شخصی سطح پر فرمان صاحب نے غالب کو ایک عظیم کے پیکر میں دیکھا ہے اور اس کی ذات میں انہیں محبوبی کے جلوے بھی نظر آئے ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کی انہوں نے پوری فراخ دلی سے داودی ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحقیق اور تنقید دونوں کا دامن افراط و تفریط کی دست برد سے محفوظ رہا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید مصین الرحمن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پندرہ مقالات پر مشتمل ایک مجموعہ ”غالب، شاعر امروز و فردا“ ستمبر ۱۹۷۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ پروفیسر سید وقار عظیم کے لفظوں میں، کسی شاعر کو بیک وقت شاعر امروز و فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آوازیں سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیان فصل و بعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانونِ فطرت نے ہر عہد کے انسان کو مشلک کیا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی ملبوم میں شاعر امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعمیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

(نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۶۰۴)

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جس قوا تر اور انہماک کے ساتھ تنقید اور تحقیق کو اپنا مشغل اور شعار بنایا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ہماری کسی یونیورسٹی کے کسی اُردو شعبے سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ غالب سے فرمان صاحب کو ایک گونہ شغف ہے۔ ”غالب، شاعر امروز و فردا“ ان کے اسی مدّ العرص کے عشق کا مظہر ہے۔ پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کے بعض خالصتا تحقیقی مضامین، غالب کی زندگی کے بارے میں نئی معلومات کے حامل ہیں، بعض ایک نئے تنقیدی زاویے سے غالب کے کُردوں کے تخلیقی گوشوں کو سامنے لاتے ہیں اور بعض مضامین میں تحقیق و تنقید، دونوں کے خوشگوار احتراج سے قاطبِ قدر نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

غالب صدی پر بلا مبالغہ کئی سو کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے، خود میرے ذاتی ذخیرہ غالبیات میں صرف غالب صدی کے موقع پر شائع ہونے والی دوسو سے زیادہ

کتابیں (یا کتابی اہمیت کی چیزیں) موجود ہیں لیکن بھلا صرف ان چیزوں کے لیے ہے جو عالم انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں۔ غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب ان کے کم و بیش ایک چوتھائی صدی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ فرمان صاحب کے نقطہ نظر میں تاریخی اور اسلوب میں توانائی ہے اور اس لیے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اہم کتاب، غالب صدی پر شائع ہونے والی ان سینکڑوں کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ کتاب پاکستان اور پاکستان سے باہر دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں اضافی مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہے اور بہت شوق سے پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پہلا معلوم مقالہ ”غالب کے کلام میں استفہام“ کے موضوع پر ہے۔ ”غالب، شاعر امروز و فردا“ میں شامل ان کا یہ مقالہ چالیس یا پچاس برس پہلے رسالہ ”نگار“ لکھنؤ، شمارہ مئی ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع پر غالبیات میں پہلا مقالہ اور مطالعہ ہے بلکہ اب چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلچسپی اور اس کی شادابی اور تاریکی میں سرسوخ نہیں آیا۔

کلام غالب کے استفہامی لب و لہجہ کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور و فکر کی راہیں بھانکیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔ جناب محسن الرحمن فاروقی نے رسالہ ”غالب نامہ“ دہلی (شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء) میں فرمان صاحب کا حوالہ دیتے بغیر ”اعداد گفتگو کیا ہے؟“ کے عنوان سے غالب کے طرز استفہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ”محسن الرحمن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے ”غالب کے کلام میں استفہام“ (مطبوعہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ان کی ایک کتاب ”تحقیق و تنقید“ (کراچی ۱۹۶۳ء) نیز ان کی ایک دوسری اہم کتاب ”غالب: شاعر امروز و فردا“ (لاہور ۱۹۷۰ء) میں بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ ”تنقید غالب کے سوسال“ نامی کتاب (مرتبہ فیاض محمود پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء) میں بھی منتخب ہوا۔

(غالب نامہ، تجزیاتی مطالعہ، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۴ء)

میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات کے بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔

مئی ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ”نگار“ (کھٹنڈ) کے صفحات پر اول لاول سامنے آیا اور بعد اس کے سندھ لہر و لہر حسینی مباحث کا باعث ہوا۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رسالہ ”نگار“ کھٹنڈ کی چنی زندگی کے عجائبات میں سے تھا۔ اونچے طبقے میں صاحب علم اور صاحب ذوق ہونے کی پہچان یہ تھی کہ ”نگار“ کا خریدار ہو اور اس کی راہوں پر بحث کر سکتا ہو۔ ”نگار“ محض ادبی جریدہ نہیں بلکہ ایک ادارہ، ایک رجحان، ایک قدر تھا۔ ”نگار“ کا نام ندوۃ العلماء، سلطان المدارس اور کھٹنڈ یونیورسٹی کے ساتھ لیا جاتا تھا اور ”نگار“ میں مضمون چھپ جانا دیکھا ہی تھا جیسا کہ ان علمی اداروں سے سند مل جائے۔

(نگار پاکستان، کراچی، نیا نمبر، حصہ اول، سالانہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اسی ”نگار“ سے مئی ۱۹۵۲ء میں ان کے مقالے ”غالب کے کلام میں استغناء“ کی اشاعت پر ادبی تنقید کی سند ملی۔ یہ چالیس یا پچاس سال پہلے کی بات ہے جب کہ آج کے بہت سے نامور غالب شناسوں نے غالب پر لکھا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ یا غالب سے متعلق ان کی کوئی قابل ذکر تنقیدی تحریر اس وقت (۱۹۵۲ء کے نصف اول) تک سامنے نہیں آئی تھی۔ مجھے نہیں خیال کہ ڈاکٹر طلحہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، کالی داس گپتا، رضا ڈاکٹر وحید قریشی، مرتضیٰ حسین، فاضل کھٹنڈی، ڈاکٹر گیان چند، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر ثار احمد فاروقی، ڈاکٹر ظہیر انجم، اکبر علی خاں عرشی زادہ اور قدیم نقوی ایسے ممتاز غالب شناسوں کی غالب سے متعلق کوئی قابل لحاظ تنقیدی تحریر ۱۹۵۲ء سے پہلے شائع ہو کر توجہ کا مرکز بنی ہو۔

”غالب: شاعر امر و فردا“ میں فرمان صاحب کے چند مقالے شامل ہیں جو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۹ء تک کا حاصل ہیں لیکن یہ اس مرحلے کا مکمل حاصل نہیں۔ غالب کے بارے میں بہت سی تحریریں اس کتاب میں شامل نہیں۔ مثلاً اس جگہ فرمان صاحب کی ان تحریروں کے چند حوالے بے محمل نہ ہوں گے:

- ۱۔ غالب کا ایک غیر معروف قطعہ، افکار نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء۔
- ۲۔ غالب دامن کا زمانہ، دہلی کا ایک اہم ذور، مشمول: اردو ر باغی ۱۹۶۲ء۔
- ۳۔ جدید اردو غزل، غالب سے حالی تک، سالانہ نگار، کراچی ۱۹۶۵ء۔
- ۴۔ غالب اور دوسرے مضامین (تیسرہ) نگار، کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء۔
- ۵۔ جہان غالب (تیسرہ) نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء۔

۶۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی، سیپ، کراچی، شمارہ ۸۔

۷۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب (تیسرہ) نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء۔

۸۔ احوال و تہذیب غالب (مقدمہ تیسرہ) نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۶۷ء۔

۹۔ غالب و مرثیہ، ہماری زبان، جلی گزشتہ ۱۵، ابرو نمبر ۱۹۶۸ء۔

یہ ۱۹۶۹ء کے بعد اب (۱۹۹۳ء) تک غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مختلف مواقع اور حوالوں سے اتنا کچھ مزید لکھا ہے کہ اسے لکھا گیا جائے تو ایک مستقل مجموعے کو کفایت کرے لیکن یہاں میں ان کے صرف ایک مقالے کا ذکر کروں گا۔ ”کیا دیوان غالب نسخہ امر و ہدو واقعی جعلی ہے؟“ کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کا یہ معرکہ آرا تحقیقی مطالعہ، رسالہ ”غالب“ کراچی (شمارہ ۸، ۹، ۱۰ سال ۷۷-۷۸ء) میں شائع ہوا۔ اس مقالے کے مشمولات سے جزوی یا کلی اختلاف ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بحث ہے جس کا یہ محل نہیں لیکن یہ مقالہ فرمان صاحب کی جرات، اظہار کی بہت اچھی مثال ضرور ہے اور اس موضوع پر بلا قید مقام اور وقت جہاں اور جب بھی بحث ہوگی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس مقالے سے صرف نظر نہیں کیا جاسکے گا۔

خوش آنکھ بات یہ ہے کہ غالب کے بارے میں فرمان صاحب ہنوز برابر سوچ رہے ہیں، لکھ رہے ہیں اور ان کا قلم آج بھی غالب کی کھوج میں رواں دواں ہے۔ چنانچہ پچھلے دو برسوں میں تنقید غالب کے سلسلے میں ان کے بعض اہم مقالات شائع ہوئے ہیں، مثلاً:

۱۔ ہم عصر سماجی مسائل کا ادراک اور غالب

(غالب نامہ، دہلی) جولائی ۱۹۹۲ء، سالنامہ صریح کراچی، ۱۹۹۱ء)

۲۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر

(سہ ماہی تماشا (کراچی) شمارہ ۹۴، جلد ۱، ۱۹۹۳ء)

۳۔ غالب کی شاعری اور مسائل تصوف

(سالنامہ ”صریح“ کراچی، بابائت جون، جولائی ۱۹۹۳ء)

۴۔ کلام غالب میں لفظ ”تمنا“ کی تکرار

(خاص نمبر، ادراک، لاہور، ۱۹۹۳ء)

کہنا یہ ہے کہ فرمان صاحب نے ”غالب، شاعر امر و زو فردا“ کی اشاعت کے بعد پچھلے ۲۳، ۲۴ برس میں ابھی غالب سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا، اگرچہ وہ صرف غالب ہی کے ہو کر

کبھی بھی نہیں رہے، انہوں نے ایک موقع پر کہا ہے کہ:

”غالب کی شخصیت یک پہلو نہیں، ہشت پہلو ہے، ان کا فن
 یک رنگ نہیں صد رنگ ہے، ان کی اوریت یک شیوہ نہیں،
 ہزار شیوہ ہے، ان کی ذات یک صفت نہیں، جامع الصفات
 ہے، اردو میں ان کی اولیات ایک دو نہیں متحد ہیں اور
 شعر و ادب پر ان کے احسانات دو چار نہیں، بے شمار ہیں۔“

میں بھی بات خود فرمان صاحب کے بارے میں کہتا ہوں، محض کہتا ہی نہیں، اس پر
 ایمان بھی رکھتا ہوں۔

(۱۹۹۳ء)

پروفیسر اسلم انصاری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی کے چند پہلو

مرزا غالب کی عظمت فکرو فن اُردو شعرو ادب اور اُردو تنقید کے مسلمات میں سے ہے اگرچہ ان کے کلام کی تفہیم کا عمل ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن غالب شناسی کا آغاز صحیح معنوں میں مولانا حالی کی گراں قدر تصنیف ”یادگار غالب“ سے ہوا اس اعتبار سے گزشتہ سوا صدی کی مدت کو غالب فنی اور غالب شناسی کا زمانہ بھی کہا جاسکتا ہے اگرچہ میر پر غالب اور اقبال سے کہیں کم لکھا گیا ہو گا لیکن میر، غالب اور اقبال اُردو کے منفرد اور عظیم شعراء ہیں جن کے مطالعے نے اُردو شعرو ادب کے بہترین اوقیان کو مصروف رکھا اور جن کے بارے میں لکھی گئی تنقید سے اُردو نقد و ادب میں فکرو نظر اور نقد و تحسین کے کئی نئے راستے کھلے۔ اس اعتبار سے اُردو تنقید سب سے زیادہ غالب اور اقبال کی رہن منت ہے۔ جن کے فکرو فن کا مطالعہ اُردو تنقید کے سرمائے میں روز افزوں اضافے کا باعث ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو تنقید کا دائرہ کار موضوعات کے اعتبار سے گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی میں بہت وسیع ہوا ہے اور اُردو کے تمام اہم اور قابل ذکر شعراء کی طرف قابل قدر تھادوں کی توجہ مبذول ہوتی رہی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو غالب اور اقبال دو ایسے دائروں کے مرکزی نقطے دکھائی دیتے ہیں جو بہت زیادہ نقاط پر ملتے ہیں اور بہت کم نقاط پر جدا ہوتے ہیں غالب کا مطالعہ ناگزیر طور پر اقبال کے فکرو فن کے پہلوؤں کے مطالعات کو شامل ہو جاتا ہے اور اقبال کا مطالعہ ناگزیر طور پر غالب شناسی کی راہوں پر لے جاتا ہے لیکن اس کے باوجود غالب اور اقبال اپنی اپنی دنیاؤں کے خالق ہیں اور بہت سی مماثلتوں کے باوجود اپنی اپنی انفرادیت کے چرچہ سے ممتاز اور منور ہیں۔ غالب شناسوں کی بزم میں ایک متحین صف ان کے شارحین کی بھی ہے جن کی کاوشوں نے نقد غالب کی دشار گزارا رہا کو آسان کیا ان میں پیمبر پیرا کیے، اسی طرح غالب کے سوانح نگاروں نے تاریخ و تہذیب کے بہت سے نا شناخت پہلوؤں کو

بے نقاب کیا یا کم متعارف حقائق کو روشن کیا بعض ناقدین غالب نے غالب کے فن اور بعض نے فکر و فلسفہ اور بعض نے دونوں سے امتناء کیا غرض تحقیق و تنقید اور تاریخ و سوانح نگاری کے کتنے ہی اسالیب صرف مرزا غالب کی بدولت وجود میں آئے مثلاً ”محاسن کلام غالب“ ایسا تنقیدی اور انشائی شاہکار (بعض انہما پسندادہ دہوں کے باوجود) صرف غالب ہی کی وجہ سے وجود میں آسکا۔ شعر و ادب کے بدلتے ہوئے تصورات اور نقادوں کے بدلتے ہوئے اسالیب نے بھی غالب کے فکر و فن کو ہر اعتبار سے اہم اور گراں مایہ پایا چنانچہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں وجود میں آنے والی ترقی پسندی تحریک سے لے کر عصر حاضر تک آرو و تنقید کے لیے مرزا غالب کے فکر و فن اور شخصیت کی کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر دور ہر تحریک اور ہر نسل نے مطالعہ غالب کا حق ادا کرنے کی اپنی سعی کی ہے اور یہ سعی کسی حال میں بھی بے ثمر یا لا حاصل ثابت نہیں ہوئی عظیم شاعری کی سب سے بڑی نشانی بھی یہی ہے کہ اس کی روشنی میں آنے والا نہ صرف یہ کہ ظاہر میں اپنے آپ کو منور پاتا ہے بلکہ اپنے اندر کی روشنی سے بھی بقدر ظرف و استطاعت روشناس ہو جاتا ہے۔ گزشتہ چار یا پانچ دہائیوں میں غالب کے جن نقادوں نے اپنی ستائش و عظمت نظر کے اعتبار سے شہرت پائی یا امتناء کا درجہ حاصل کیا ہے ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بھی ہے جن کے ہاں تحقیق و تنقید کے اعتدال نے ایک ایسے نقطہ نظر کی حیثیت اختیار کر لی ہے جو جامعیت کی تعریف کے بہت قریب ہے پھر حاضر کے غالب شناسوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اپنے نقطہ نظر کی چنگیزی اور ممکن حد تک معروضیت اور تجزیاتی طریق کار کی بدولت ایک خاص اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے۔

مرزا غالب کی شاعری میں فلسفیانہ افکار کی تلاش و استخراج اور دنیا کے بعض بڑے مفکروں کے خیالات و نظریات کے ساتھ ان کی تطبیق پیدا کرنے کے سلسلے میں اولیت کا سہرا شاید بجنوی ہی کے سر ہو، تاہم یہ کام پوری وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کیا (انکار غالب) اور غالب کے ایک ایک شعر پر بعض اوقات ایک ایک باب لکھا اور دنیا کے اکثر عظیم فلسفیوں کے افکار کے ساتھ غالب کی جزوی یا کلی مشابہت ثابت کی لیکن غالب کے کلام میں کس مربوط نظام فکر کی تعین شیخ محمد اکرام نے کی اور اس کے بعد اس سلسلے کو کافی فروغ حاصل ہوا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بعض اہم مقالات میں بھی غالب کے کلام سے بعض مربوط سلسلہ ہائے خیال کے استخراج کی سعی مفکرانہ دکھائی دیتی ہے اس سلسلے میں ان کا پہلا مضمون ”غالب کے کلام

میں استعمال ہے بقول ان کے مئی ۱۹۵۲ء میں نگار (گھنٹہ) میں شائع ہوا اس مضمون کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

”یہ مضمون غالب اور غالبیات کے باب میں میرے اس طویل مطالعے اور مسلسل غور و فکر کا حاصل تھا جسے میں ہائی سکول کی طالب علمی کے زمانے سے اپنائے ہوئے تھا خیرے حق میں یہ غالب کا احسان اور مطالعہ غالب کا فیضان تھا کہ میرے اس مضمون کو تنقید غالب کے سلسلے میں بالکل نیا اور چونکا دینے والا مضمون خیال کیا گیا ہمارے علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے داد دی گئی اور مجھے غالب کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔“

اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مرزا غالب کے ایک چوتھی رجحان یعنی استفسار پسندی کا پہلی بار ایک تفصیلی مطالعہ پیش کیا اور طرز سوال کو غالب کے شعری لہجے کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت قرار دیا لیکن بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس مضمون کو انہوں نے قتی تنقید کے اصولوں تک محدود رکھا اور اس تجویزاتی طریق کار سے کام نہ کیا جو ہمیں ان کے بعض دوسرے اہم مضامین میں بروئے کار آتا دکھائی دیتا ہے یعنی غالب کی استفسار پسندی کی چوتھی روش کے نفسیاتی محرکات سے پسند نہیں کیا گیا اس کے باوجود اس مضمون کی اہمیت اور معنوی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مضمون جو ان کے مجموعہ مقالات تحقیق و تنقید (۱۹۶۲ء) میں شامل ہوا غالبیات کے حوالے سے ان کے اولین مجموعہ مقالات ”غالب شاعر امر و زوہد و فردا“ کی زینت تھا اور ان کے دوسرے مجموعہ مقالات غالبیات ”تمنا کا دوسرا قدم اور غالب“ میں بھی اس کی تلخیص شامل کی گئی۔ ڈاکٹر فرمان صاحب مطالعہ غالب سے اپنی دانشمندی کو زمانہ بدو شعور تک لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”طبعا تو میں غالب کے دعویٰ نبوت

مگر شعر و سخن بہ ہر آئین بودے

دیوان مرا شہرت پر دین بودے

غالب اگر اس فن سخن دین بودے

آن دین را بزدلی کتاب این بودے

پر اس وقت ایمان لے آیا تھا جب کہ مجھوں لام الف نکلے تھا دیواروں ہستان پر (دیباچہ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، م، X) گویا غالب کے قمر فتن کا مطالعہ ان کی ذہنی اور عملی زندگی کا حاصل ہے غالب ان کے لیے ایک دائمی رہنما ہے فخر کی حیثیت رکھتا ہے وہ اس کے قمر فتن سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور اس روشنی کو زندگی اور شعروادب کی حسیں و تفہیم میں صرف کرتے ہیں اگر وہ زندگی کے تضادات کو سمجھنے کے لیے جیکل اور ہیڈو آریٹلڈ اور اقبال اور مجھوں گورکھ پوری کا مطالعہ بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کی حقیقی جدلیت ان پر غالب کے ایسے اشعار کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے:

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی
لطافت ہے کشاکش جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

اس طرح اگرچہ محاکات شعری کے سلسلے میں انہوں نے مقدمہ شعرو شاعری اور شعرا لہجہ میں بہت بڑا حلقہ لیکن ذوق کی نشانی اور ذہن کی سیرانی غالب کے اس طرح کے شعروں سے ہوئی:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زنجیر جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے خلعت گل ہائے ناز کا!

غرض معاشی عدم مساوات سرمایہ و محنت کی کشاکش رجائیت و قنوطیت کی کشاکش کائنات میں ارتقائے حیات اور معارف و حکم انفرادی کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں ان کے ذوق تفہیم و حسیں کی تسکین مطالعہ غالب ہی سے ہوئی ہے ایسا نقاد جواہر لعل علی اور عملی زندگی میں کسی ایک شاعر کے کلام کو ممتاز نہ قرار دے سکتے ہیں ہدایت قرار دے سکتے ہیں شاعر کے بارے میں داد تحقیق و تنقید دیتے ہوئے یقیناً بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سرمایہ نقد غالب ایسی ہی بہترین صلاحیتوں کا اظہار ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کے سرمایہ نقد غالب کو بآسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

یعنی (۱) تحقیقی اور (۲) تنقیدی۔ یعنی وہ مقالات جو بنیادی طور پر تحقیقی ہیں اور وہ جو بنیادی طور پر تنقیدی ہیں البتہ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ تحقیق و تنقید دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جس تنقید کی اساس تحقیق پر نہ ہو وہ اکثر یا در ہوا ثابت ہوتی ہے اور جس تحقیق کو تنقید کی روشنی نصیب نہ ہو وہ اند میرے میں ناکہ لٹیاں مارتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب تحقیق کی روشنیوں کو جانتے ہیں اور تنقید کے نقاضوں کو بھی سمجھتے ہیں اس لیے ان کے تحقیقی مضامین میں تنقید کی چاشنی اور تنقیدی مضامین میں تحقیق کی روشنی بدستور موجود رہتی ہے۔

ان کے تحقیقی مقالات میں درج ذیل مقالات خاص اہمیت کے حامل ہیں:

- ۱۔ غالب کے اولین تعارف نگار (مشمول غالب شاعر امروز و فردا)
 - ۲۔ غالب اور غالب تخلص کے اردو شعر (ایضاً)
 - ۳۔ تھل شرح دیوان غالب پر ایک نظر (ایضاً)
 - ۴۔ غالب کی یاد نگار قائم کرنے کی اولین تجویز (ایضاً)
 - ۵۔ غالب کے حالات میں پہلا مضمون (ایضاً)
 - ۶۔ غالب کے اثرات جدید اردو شاعری پر (مشمول تمنا کا دوسرا قدم اور غالب)
 - ۷۔ کیا دیوان غالب نسخہ امر و ہدایتی چلی ہے؟ (ایضاً)
- اس طرح تنقیدی مقالات میں ذیل کے مقالات انفرادی خصوصیت کے حامل ہیں:
- ۱۔ غالب کا نفسیاتی مطالعہ (مشمول غالب شاعر امروز و فردا)
 - ۲۔ غالب کے کلام میں استغنیام (ایضاً)
 - ۳۔ غالب شاعر امروز و فردا (ایضاً)
 - ۴۔ غالب اور تنجیہ معنی کا حلسم (ایضاً)
 - ۵۔ کلام غالب میں تمنا کی تکرار (ایضاً)
 - ۶۔ بطور استعارہ فلسفہ آج (مشمول تمنا کا دوسرا قدم اور غالب)
 - ۷۔ کلام غالب میں استغنیام (ایضاً)
 - ۸۔ غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا (ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کے مقالات میں دو مقالے الگ نوعیت کے ہیں جن میں انہوں نے غالب اور اقبال کے فکر و فن کا مطالعہ کیا ہے۔ ان مقالات کی اپنی اہمیت ہے ”غالب کے اولین

تعارف نگار "اور" غالب اور غالب تخلص کے شعرا "دیباچہ اول کی تحقیق کے نمونے ہیں اول الذکر مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا حالی کی اس روایت کا تجزیہ کیا ہے جس کی رو سے میر تقی میر نے غالب کے بارے میں کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا تو لا جواب شاعر بن جائے گا ورنہ پھل مگو ہو جائے گا۔ انہوں نے مولانا غلام رسول مہراور مالک رام کی تحقیقات کا جائزہ لیا ہے اور مالک رام کی تائید کی ہے جنہوں نے مولانا حالی کی روایت کو پہلا مکمل درست ثابت کیا ہے۔ غالب کے ابتدائی کلام اور ابتدائی معاصرین اور تذکرہ نگاروں کی آراء کو اس مضمون میں تنقیدی تحلیل و تجزیہ کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور نقد غالب کی ابتدائی صورتوں کے مطالعے کے لیے یہ مقالہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ثانی الذکر مقالہ (غالب اور غالب تخلص کے شعراء) بھی غیر معمولی کاوش سے لکھا گیا ہے اور غالب تخلص کے دس شعراء کے حالات اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک تو خود مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں اور باقی "نو غالبین" کے تراجم اور نمونہ ہائے کلام مختلف تذکرہ نگاروں سے لیے گئے ہیں اس مضمون میں بعض ایسے اشعار پر بحث کی گئی ہے جو غالب کے ہیں اور دوسرے غالب تخلص شعراء سے منسوب ہو گئے ہیں اور یا غالب تخلص کے دوسرے شعراء کے ہیں اور غالب کے نام سے مشہور ہیں۔

تنقیدی مقالات کے مطالب و مباحث اور ان کی طوالت و ضخامت کو دیکھا جائے تو تحقیقی مقالات کے مقابلے میں ان کا پلہ بھاری نظر آتا ہے ان مقالات کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کو لکھتے ہوئے پہلے سے کسی نقطہ نظر کی پابندی یا کسی پہلے سے طے شدہ نظریے کے اطلاق کو لازمی قرار نہیں دیا گیا بلکہ زیادہ تر داخلی شواہد سے کام لیا گیا ہے البتہ ہر مرحلہ استدلال میں معروف و ممتاز نقادان غالب کی آراء و استدلال کو ضرور سامنے رکھا گیا اور ان سے تائید و تردید کا کام لیا گیا ہے۔ اس خصوصیت نے ان مقالات کو نقد غالب کے ایک تنقیدی جائزے کی صورت بھی عطا کر دی ہے ان مقالات میں ہر چند جگہ جگہ غالب سے جذباتی وابستگی اپنی جھلک دکھاتی ہے اس کے باوجود ممکن حد تک معروضی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے بالخصوص "غالب کا نفسیاتی مطالعہ" معروضی نقطہ نظر کی ایک خوبصورت مثال ہے مقالہ اگرچہ محبت اور ہمدردی کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن غالب کی زندگی کے داخلی اور خارجی تضادات پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور اس کی کسی کمزوری کو معاف نہیں کیا گیا۔ اصل میں اس مضمون کا لا شعوری محرک غالب کے بارے میں لکھا ایسے مقالات اور تاثرات ہیں جن میں جن میں لکھنے والوں نے غالب کے بارے میں بہت سخت بلکہ

بعض صورتوں میں معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے اگرچہ معاشی حوالے سے نکستی مگنی غالب کی بعض تحریروں کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو بھی وہ ”پرلے درجے کے خوشامدی اور بھات“ اور ”واقعی گداگر“ معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے مرزا کے تضادات و لغز و وضع ذہنت کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اکثر شعراء کے ہاں یہ تضاد موجود رہا ہے اور رہتا ہے ان کا یہ انتخاب خاصا ذہنی ہے کہ اپنے بارے میں لکھی ہوئی مرزا غالب کی ہر بات کو اس کے ظاہر و محمول نہ کیا جائے بلکہ اس بات کی تدابری پر غور کیا جائے اور اصل ایسا تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اس سلسلے میں ان کا استدلال ہے کہ اگر مرزا غالب اپنی فارسی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری کو ”رنگ“ قرار دیتے ہیں تو یہ ایک صحیحہ و بیان ہے اس کو اس کے ظاہری معنوں میں قبول نہ کیا جائے اس میں شک نہیں کہ مرزا کی تمام تر شہرت مقبولیت اور عظمت کا انحصار ان کے اردو کلام پر ہے۔ جن لوگوں نے ان کے اردو اور فارسی کلام کو ساتھ رکھ کر پڑھا ہے وہ بھی بنیادی حوالہ اردو شاعری ملی کو بناتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اگر مرزا جدید بیان کی ”نفسِ حمید“ پر تنقید نہ کرے تو صرف مرہجہ دیوان سے ان کے فکر و تخیل کے تمام الوان کا احاطہ کرنا مشکل ہو جائے گا اس کے باوجود جن لوگوں کو غالب کے فارسی کلام کے غائر مطالعے کے مواقع حاصل ہیں وہ بحث ان کے فارسی کلام کی برتری کے قائل ہیں جب دوسرے اصحاب ذوق و نظر کی یہ صورت ہے تو خود مرزا غالب جو فنی اعتبار سے بلا مبالغہ خود آگہی کے بلند ترین مراتب پر فائز تھے کس طرح اس حقیقت سے آگاہ نہ ہوں گے البتہ اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غالب نے یہ موازنہ اپنی اردو اور اپنی فارسی شاعری کے درمیان کیا ہے اس موازنے سے خود اردو شاعری کے تناظر میں ان کی اردو شاعری کی قدروقیمت کسی طرح کم نہیں ہو جاتی بہر حال ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بہت حد تک جرأت مندی کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ ان (غالب) کے یہاں طرزِ عمل کا تضاد زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے ” نیز یہ کہ اقوال و بیانات خواہ وہ ان کے اشعار میں ہوں یا نثر میں نہایت گمراہ کن ہیں ان میں وقتی مصلحتوں اور ذوراندیشیوں کا بڑا دخل ہے اس لیے ان کی تردید یا تائید سے پہلے ان کی دوسری تحریروں پر نظر ڈال لینا چاہیے۔“

ان کے معروف مقالے ”کلام غالب میں استغلام“ کو ہرگز نظر کے غالب شناس نے پسند کیا ہے اور اس کی تحسین کی ہے غالب کے حکیمانہ ذہن میں تلاشِ حقیقت کے لیے جو اضطراب طبعی طور پر موجود تھا اس کی رہنمائی زیادہ تر اس اندازِ استغلام میں ہوتی ہے غالب کے ان

استغنیائی لہجوں اور اسالیب کو پہلی بار ڈاکٹر فرمان صاحب نے یکجا کیا اور ان کا مطالعہ بطور ایک فنی حربے کے کیا ہے۔ یہ ایک قابل قدر مطالعہ ہے طرز استغنیام خطابت اور شاعری دونوں کا حسن ہے اس سے خطاب اور شاعری دونوں میں ڈرامائیت پیدا ہوتی ہے اور محاکاتی تفصیل کی تحمیل ہوتی ہے مرزا غالب سے بڑھ کر طرز استغنیام کا کفہ شناس کون ہو سکتا تھا انہوں نے اس اسلوب کو اس کے تمام تر تنوعات کے ساتھ بھرپور انداز میں استعمال ہے۔ حذکرہ مقالے کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے کہ غالب کے ہاں استغنیام ایک فنی حربے کے طور پر استغنیام اور فلسفیانہ انداز فکر کے طور پر کیا اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے دوسرے مجموعہ مقالات نقد غالب کا سب سے اہم دینی ہے جس سے کتاب کا عنوان اخذ کیا گیا ہے یعنی ”کلام غالب میں لفظ قننا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آواز“ اس قابل قدر مقالے میں غالب کی آرزو مندلی اور قننا پسندی کا وقت نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے اور کلام غالب میں لفظ ”قننا“ کی معنویت پر بہت قیمتی بحث کی گئی ہے اور بہت اہم سوال اٹھائے گئے ہیں اس مضمون میں ان کا تعارفی جملہ بہت لطیف ہے کہ ”ان (غالب کی) سرشت و مزاج کا وہ پہلو جو انہیں بہر گام بہر روش ہدیت پسند، فلسفہ طراز، مستغنیل ہیں و فر و شناس، خود چین و آزاد و مرد ہر لمحہ حنفیہ و شمس اندیشہ ہائے دور و دراز میں غلغلان اور مشاہد حق کے گنگو میں از خود رفتہ بنائے رکھتا ہے دراصل لفظ ”قننا“ سے آجا کر ہوتا ہے کسی دوسرے لفظ سے نہیں ہوتا گویا ”قننا“ کا لفظ غالب کے یہاں محض وسیلہ حسن تکرار نہیں بلکہ معنی کی سطح پر ایک استعارہ فلسفہ آواز بھی ہے۔ (ص ۱)

غالب کی اردو شاعری میں واقعی اس لفظ کی حیثیت کلیدی ہے تنہا یا ترکیب کے جزو کے طور پر غالب نے اس لفظ کو جہاں بھی استعمال کیا ہے معنویت کی ایک خوبصورت اور تہ و دار صورت وجود میں آگئی ہے دیکھا جائے تو غالب کے ہاں بھی ”قننا“ کا لفظ اور تصور جرمن مفکر شاپین ہائیر کی طرح وجود کی ناقص کا استعارہ ہے۔ یکجا وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس لفظ کو غالب کے ہاں فلسفہ آواز کا استعارہ قرار دیتے ہیں اگرچہ اس بے حد قبح مضمون میں فلسفہ آواز کی اصطلاح کی تشریح نہیں کی گئی تاہم ظاہر اس سے فلسفہ مظہریت یا مظہریت پسندی ہی مراد ہو سکتی ہے جو عصر حاضر کے اہم اور مقبول فلسفیانہ ہستان میں سے ہے یہ ہستان ظاہر اور باطن مظہر اور مظہر کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا اس کے نزدیک مظاہر اور آثر ہی اصل حقیقت ہیں کیونکہ ہمارے مشاہدے

کی گرفت میں بھی مظاہر ہی آتے ہیں مرزا غالب اگر چہ غا ہر اور باطن یا ظہور و بطن کی تفریق کے قائل ہیں اور بطن یا معنویت (خیر سے) زیادہ سروکار رکھنے کا اوجہ رکھتے ہیں لیکن ظہور و آثار کی رجحانیں اور پوئلگھوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں:

دل مت گنوا، خبر نہ سخی، سیر ہی سخی

اے بے و ماغ، آئینہ شمال دار ہے !

مرزا کو آئینے کے شمال دار ہونے کی خصوصیت جس حد تک سمجھ کر تھی اور رکھتی ہے اس کی روشنی میں ان کے شوقِ تمنا کو ان کے فلسفہ آوار کے ساتھ مربوط کر کے دیکھنا بے جا نہیں بلکہ ان کی ایک خاص فکری جہت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں فاضل نقاد نے شارحین غالب کی بعض تشریحات کو بھی شامل بحث کیا ہے اور اس طرح ”لفظ تمنا“ کی مختلف معنوی پہلوؤں کو آشکار کیا ہے یوں تو اس مضمون کے پیش تر جسے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے (اگرچہ اس سے بھی کچھ تطویل ہو ہی جائے گی) صرف دو مربوط اور اگر اذیل میں نقل کیے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنی بحث کو سمیٹے ہوئے لکھتے ہیں:

”لفظ تمنا کے حوالے سے ... ساری بحث کو ذہن میں رکھیے تو

کہنا پڑتا ہے کہ غالب کے یہاں تمنا کا لفظ محض آرزو،

خواہش، شوق، اشتیاق، محبت، عشق، طلب، جذب، جنون،

نگہن، لگاؤ، دھن اور مستی وغیرہ کا سادہ مترادف نہیں ہے بلکہ

اس سے بڑی وسعت ہے اور یہ دراصل استعارہ ہے حرکت و

فعالیت کا تحریک و تغیر کا خود اعتمادی اور خود اختیار کی کا،

نا سادہ کار حالت سے ستیزہ کاری کا، زندگی سے بہر حال،

وابستہ رہنے کا اور اسے تسخیر کرنے کا، شرر سے ستارہ اور

ستارے سے آفتاب تک پہنچنے کا خوب سے خوب تر کی تلاش

میں خود کو کھوئے رکھنے کا، آدمی کو محشر خیال سمجھنے کا اور ارادہ و

عمل میں اسے مختیار جاننے کا، لا انہما کی انہما تک پہنچنے کا،

آرزو مند کی کا، بے نہایت حصول کے لیے کوشاں رہنے کا

ذہن انسانی کی رسائیوں کو بے کراں جاننے کا، اور اس کی فتح

مندی و کامرانی پر یقین رکھنے کا زمانے کی نا اہماری کا
مقاومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کا اور یاس و نا اُمیدی کی
تاریک فضا میں رجائیت و اُمید کے چراغ جلانے رکھنے کا۔
گویا غالب کے یہاں تمنا کا لفظ کم و بیش وہی معنی رکھتا
ہے جو اقبال کے یہاں شوق و آرزو یا عشق و جنوں کا مفہوم
ہے جس طرح اقبال کے یہاں عشق کسی اضطراری کیفیت کا
نام نہیں بلکہ زندگی کے ایک طاقتور محرک کا نام ہے بالکل اسی
طرح غالب کے یہاں تمنا کا لفظ محض سادہ سی آرزو و مندی
کے معنی نہیں رکھتا بلکہ یہ فطرت انسانی کے اس فوق طلب اور
شوق بے پایاں کی نمائندگی کرتا ہے جو زندگی کو متحرک اور
بامعنی بنائے رکھتا ہے۔ نت نئے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے پھر
ان مقاصد کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ عمل
مہم آزما ہونے کے باوجود اسے درد مند نہیں کرتا بلکہ اس میں
زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑا دیتا ہے۔“ (ص ۱۸-۱۹)

”غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا“ بھی ایک گہرا تجزیہ مضمون ہے جس میں غالب کی
جدت پسند ذہنیت کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کیا گیا ہے ان کے مشاہدے، تجزیے اور طرز فکر کی
لطیف کیفیتوں کے امتیازات واضح کیے گئے ہیں اور زبان و الفاظ کے ترک و استعمال سے لے کر
خوب و ناخوب کے عمومی معیار تک غالب کی جدت طرازی اور ترقی پسندانہ مزاج کو واضح کیا گیا
ہے۔ غالب کے مخصوص ذہنی رجحانات اور اسالیب بیان کی روشنی میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے
بہا طور پر غالب کو آج ہی نہیں کل کا شاعر بھی قرار دیا ہے غالب کے فکر و فن کے اس پہلو کا مطالعہ
ان کے ایک اور مضمون ”غالب شاعر امروز و فردا“ میں بھی پیش کیا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے
کہ غالب کے کلام میں ہمارے معاشرے کے تاریخی ارتقاء اور اجتماعی رویوں کی تبدیلی کا ساتھ
دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے جو اسے ہر عہد کا شاعر ثابت کرتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دونوں مجموعہ ہائے مقالات یعنی ”غالب شاعر امروز و فردا“
اور ”تمنا کا دوسرا قدم اور غالب“ ان کے وسیع تر اور عمیق تر مطالعہ غالب کے ساتھ ساتھ ایک روشن

تنقیدی اُلٹی کو بھی سامنے لاتا ہے۔ ان کے یہ مقالات نقدِ غالب میں بلا مبالغہ ایک صحیح اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اسلوبِ تنقید کے سلسلے میں ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ وہ اصطلاحات اور اندازِ بیان کے جو حتمی پکن سے بہت گریز کرتے ہیں اور کسی طے شدہ فریم ورک پر پورا اترنے کے مقابلے میں متونِ زیرِ مطالعہ سے، فریم ورک حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کے اس اصل مدعا سے کہیں بھی ڈور نہیں ہوتے اس کے باوجود ان کے اندازِ بیان کی طبیعت اور نقادانہ سنجیدگی بدستور برقرار رہتی ہے مطالب و مباحثِ اندازِ بیان اور نقطہ نظر کی ممکنہ حد تک معروضیت ان کی تنقیدات کو اور بالخصوص ان کے نقدِ غالب کو جو تو ازن اور وقار و اعتبار عطا کر رہا ہے وہ بہت کم نقادوں کے حصے میں آتا ہے۔

پروفیسر افصح وحید

بلسلہ غالب، ڈاکٹر فرمان کے غیر مرتب مقالات و متعارفات

مقالات

”فرمان صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد قاری کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ ان کے مضامین کی اپنی ایک زندگی اور چلت پھرت ہوتی ہے۔ ان کے مضامین ہانپتے نہیں تیز رفتار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی علیست کا مظاہرہ نہیں کرتے، سیدھی سادی دلیلیں دیں اور مضمون ختم!“

(سجاد باقر رضوی)

”بہشت محقق، نقاد اور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے قلم کی قلم رو بہت وسیع ہے۔“

(ڈاکٹر سلیم اختر)

”فرمان صاحب غالب کو بہت مانتے ہیں مگر اس سلسلے میں غالب کے اس مصرعے کی معنویت کو منوانے پر اصرار نہیں کرتے کہ

وہ دغم تنج ہے جس کو کہ دکھلا کیے

وہ نشتر کی آب داری کو ترجیح دیتے ہیں۔“

(رشید حسن خان)

غالب کے فکر و فن اور ان کی ذات و خدمات کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالات کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پہلا ۱۹۷۰ء میں اور دوسرا ۱۹۹۵ء میں، لیکن غالب کے بارے میں فرمان صاحب کے کچھ مقالات ایسے بھی ہیں جو غالب سے متعلق ان کے مجموعہ ہائے مطابعت میں شامل نہیں ہو پائے۔ اس باب میں ایسی چند طیر مرتب اور متفرق تحریروں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

[۱]

”غالب۔۔۔ نو دریافت بیاض کی روشنی میں“ کے زیر عنوان ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نیم تنقیدی و نیم تحقیقی نویمیت کا حامل مقالہ ۱۹۷۱ء میں ”نقوش“ (لاہور) کے غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مذکورہ مقالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ”نیا اور پرانا ادب“ جو ۱۹۷۴ء میں کراچی میں شائع ہوئی، کی زینت بنا۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”غالب صدی“ کے سلسلے کی ایک نئی دریافت ”دیوان غالب بظن غالب“ کے حوالے سے غالب کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ دریافت محمد طفیل مدبر نقوش کی مساعی سے منظر عام پر آئی اور اسے کئی ناموں مثلاً ”نظم عرش زاوہ“، ”نظم بھوپال بظن غالب“، ”نظم امر وہ“، ”غالب کی نو دریافت بیاض“ اور ”نظم لاہور“ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق اس پر درجنوں تحقیقی مقالے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں جو ان متعدد سوالات کے بساط بھر جوابات فراہم کرتے ہیں جو غالب کی ”نو دریافت بیاض“ کے مطالعے کے وقت قاری کے ذہن میں ابھر سکتے ہیں۔ البتہ بیاض کا تنقیدی نقطہ نظر سے کوئی قابل ذکر جائزہ نہیں لیا گیا اور یہ باور نہیں کرایا گیا کہ اس کی اصل اہمیت کن وجوہات کی بدولت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس مقالے میں ”بیاض“ کی اہمیت صرف غالب کے ہاتھ کا ایک قدیم خطوط ہونے تک محدود نہیں کرتے بلکہ اسے غالب کے مرتبہ شاعری اور اداعتا فن کے ثبوت میں نئی دلیلوں اور تاویلوں کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف غالب کے ارتقائے فکر و فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ غالب کے بہت سے بے دلیل دعوؤں کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ دعویٰ کہ ان کی غزل عموماً بارہ (۱۲) بیت سے زیادہ اور نو (۹) شعر سے کم نہیں ہوتی اور یہ کہ ان کی غزلیں کسی استاد کی زمین کی بجائے طبع زاد زمینوں میں ہیں۔ ڈاکٹر فرمان

کے مطابق غالب کا یہ دعویٰ ان کی قوت تخلیق اور جولانیِ ناطق کا پتہ دیتا ہے۔

مذکورہ بیاض کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے پیش نظر غالب کے صاحبِ دیوان ہونے کی عمر پرے چھ سال کم ہو گئی کیونکہ نسخہ حمید (۱۸۳۱ء) کے مطابق غالب نے اپنا دیوان بچپن (۲۵) برس کی عمر میں مرتب کیا تھا جب کہ اس بیاض کی روشنی میں اس وقت غالب کی عمر انیس (۱۹) سال سے زیادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر فرمان نے چند اشعار کی معنوی تہہ داری کو بیان کرتے ہوئے غالب کی عظمت کو اس بیاض کی روشنی میں دوبالا کیا ہے۔ نسخہ حمید کے پیش نظر یہ اشعار بچپن (۲۵) برس کی عمر کی مشقِ سخن کا نتیجہ تھے لیکن اس بیاض کے مطابق انیس (۱۹) برس کی عمر کا حاصل ہیں۔ مذکورہ اشعار کی اہمیت کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس طرح بیان کرتے ہیں:

”یہ اشعار ہر چند کہ انیس سال یا اس سے بھی کم عمری کی تخلیق ہیں لیکن بلحاظِ عمر اسے بلند پایہ ہیں کہ اگر غالب ان کے سوا اور کچھ نہ کہتے تو بھی ان کے موجودہ مرتبہ شاعری میں فرق نہ آتا۔ وجہ یہ ہے کہ متعدد جہاں اشعار میں سے متعدد ایسے ہیں جن کا حوالہ دیئے بغیر غالب کی عظمتِ شاعرانہ کا ذکر آج بھی مکمل نہیں کیا جاسکتا۔“ (۱)

مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر:

کہتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے نہ سوا کیا مجھے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ”بیاض“ کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ حالی کی بیان کردہ اس روایت کو کہ میر تقی میر نے غالب کے اشعار سن کر ان کی غباری پر حیرت کا اظہار کیا تھا، مستحق قرار دیتی ہے۔ اس روایت کو حالی (۲)، مالک (۳)، امتیاز علی حسینی (۴) اور خود غالب (۵) کے بعض بیانات و اقوال کے باوجود بھی بعض ناقدین کی طرف سے ناقابلِ اعتبار قرار دیا جا رہا تھا لیکن ڈاکٹر فرمان کہتے ہیں:

”فوری یافت بیاض کی موجودگی میں میر کی بابت حالی کی بیان کردہ روایت کو باور کرنے میں تاہل کی گنجائش نہیں رہتی۔“ (۶)

جو شخص انہیں (۱۹) برس کی عمر میں ایسا قابلِ قدر دیوان مرتب کر سکتا ہے، وہ اگر بارہ (۱۲)، تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں قابلِ توجہ اشعار کا مسودہ قرار پاتا ہے تو یہ بینِ قرین قیاس ہے کہ ڈاکٹر فرمان نے ذریعہ نظر مقالے میں غالب کے نو (۹) اشعار کا حوالہ دیا ہے جو بعض تذکروں اور شہادتوں کی موجودگی میں انہیں (۱۹) برس کی عمر سے پہلے معرضِ وجود میں آئے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر:

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر چلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم بگر چلے

ڈاکٹر فرمان کے خیال میں ”بیاض“ کی اہمیت اور انفرادیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے غالب کا بہت سا ایسا کلام سامنے آیا جس کا واحد آخذ یہ بیاض ہے، اس میں پچیس (۲۵) غزلیں، چودہ (۱۴) رباعیاں اور متعدد منفرد اشعار شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان نے ذریعہ مطالعہ مقالے میں غالب کے مذکورہ کلام کے حوالے تیس (۲۳) اشعار کا حوالہ دیا ہے کہ جو نہ صرف غالب کے فکر و فن کے بعض پہلوؤں کی تفہیم میں مددگار ہیں بلکہ غالب کے فنِ شاعری کے عروج تک کے سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے اس ”نود و یافت بیاض“ کی پذیرائی اور اہمیت کو متعین کرتے ہوئے اس کے وجود پر متوقع الزام کا بھی دلائل سے جواب دے کر اس بیاض کو تنقیدی نقطہ نظر سے غالب کے کمالِ فن کو سمجھنے کے سلسلے کی اہم دستاویز قرار دیا ہے۔ اگر غالب کے نقطہ نظر سے ان اشعار کو ناقابلِ اشاعت اور ناقابلِ انتخاب سمجھا جائے تو غالب کی شاعرانہ عظمت کی بہت سی ناقابلِ تردید شہادتیں گوشِ گنای میں چلی جائیں گی۔ اس لحاظ سے وہ ناقدین جو غالب کے نقطہ نظر سے حذف شدہ کلام کی اشاعت پر معترض ہیں، ان کی تشریح و تسلی کے لیے ڈاکٹر فرمان غالب کے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ

”ایک شاعر چونکہ اولاد معنوی ہونے کی حیثیت سے اپنے اشعار سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے، اس لیے اس کے لیے اپنے کلام کا انتخاب کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن وجہ ہے کہ جن شعراء نے اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، عام طور پر خود کو رسانی کیا ہے۔“ (۷)

اس ضمن میں دو غالب کے علاوہ میر تقی میر، میر حسن، قائم، مصطفیٰ اور شیخو کا حوالہ دیتے ہوئے شاعر کے مقام کا تعین کرنے کے لیے اس کے کلام کے اس حصے کو پیش نظر رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جسے شاعر نے اپنے انتخاب سے حذف کر دیا ہے اور اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان کے مطابق ”نور یافتہ یا ض غالب“ بھی قابل توجہ ہے۔

کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بیاض غالب کے تحقیقی جائزہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ تبصرہ نگار غالب پر اور بھی کچھ اس موضوع سے متعلق لکھا گیا ہے، پوری طرح واقف ہے۔“ (۸)

[۲]

”نقش ہائے رنگ رنگ“ کے زیر عنوان ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تنقیدی نویمیت کا حال مقالہ ”نگار“ اور ”ہماری زبان“ کے مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

زیر مطالعہ مقالہ دراصل شاہ حسین عطا کے اس مقالے کا تنقیدی جواب ہے جو اس عنوان کے تحت ”کتابی دنیا“ کے اگست ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اپنے مقالے میں شاہ حسین عطا نے غالب کے اس فارسی شعر

فارسی بین تا بہ بیی نقش ہائے رنگ رنگ

بگڑ راز مجموعہٴ اردو کہ ہے رنگ منقش

کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی شرح اور تفہیم کے ضمن میں علماء ادب کی شعر جنہی پر پڑ گیا کیونکہ ان کے نزدیک اس شعر کا مضمون ہرگز یہ نہیں کہ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اردو پر ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے زیر نظر مقالے میں شاہ حسین عطا کی اس رائے کی تردید کی ہے اور نہ صرف مذکورہ شعر سے پہلے اور بعد کے اشعار، مختلف لغات اور غالب کے خطوط کے حوالوں سے اپنے منظر کو واضح کیا ہے بلکہ اس شعر کی ہار یک جہی سے وضاحت کرتے ہوئے اس بات کا تعین کیا ہے کہ

”اردو اور فارسی کلام کا موازنہ کرنے اور فارسی کے متعلق

”بین“ اور اردو کے متعلق ”بگڑ“ کا حکم لگانے کا منطقی نتیجہ کیا

اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے کہ غالب اپنے اردو کلام کو فارسی کلام سے گھنیا خیال کرتے تھے۔“ (۹)

غالب کا اپنے اردو خطوط کے متعلق یہ دعویٰ کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، بہت بعد کا ہے۔ ابتدا تو وہ اپنے خطوط کی اشاعت کے بھی مخالف تھے اور ان کی شہرت کو اپنی خنوری کے منافی قرار دیتے تھے لہذا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاہ حسین عطا کے اس نقطہ نظر کو کہ غالب نے خطوط کے ضمن میں اردو کو فارسی پر ترجیح دی ہے، بعید از قیاس قرار دیا ہے اور اس مقصد کے پیش نظر شاہ حسین عطا نے جس خط کا حوالہ پیش کیا تھا، وہ بھی ڈاکٹر فرمان کے پیش نظر مخالف آمیز ہے۔ چنانچہ شاہ حسین عطا جیسے اہل نظر کی اس رائے پر اظہار تعجب کیا ہے کہ انہوں نے خط کے:

”سیاق و سباق کو محذوف کر کے اپنے کام کی سطریں اس خط سے نقل کر دی ہیں۔“ (۱۰)

ڈاکٹر فرمان نے یہ بات واضح کی ہے کہ غالب نے اپنی فارسی دہائی یا فارسی نظم و نثر کو اردو نظم و نثر پر ہمیشہ ترجیح دی ہے اور اس حوالے سے شاہ حسین عطا کی آراء قابل اظہار نہیں۔

[۳]

”رباعی کا ایک اہم دور“ (غالب و انیس کا زمانہ) کے عنوان کے تحت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ ان کی تصنیف ”اردو رباعی“ (۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ تحقیقی نوعیت کا حامل ہے جس میں ڈاکٹر فرمان نے غالب و انیس کے عہد میں رباعی کی قدر و قیمت کا جائزہ لیا ہے کیونکہ یہ عہد رباعی کے لیے بہت مفید تھا جس نے رباعی کو اردو شعر و سخن میں ایک بلند مقام عطا کیا۔

در نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دہلی میں غالب، ذوق، مسکن، ظفر اور لکھنؤ میں انیس اور دہرہ کے کلام کے حوالے سے رباعی کی نوعیت اور رباعیات کے کہنے میں ان کے مقام کو متعین کیا ہے۔ غالب کی رباعیات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”غالب کے یہاں تو صرف چودہ پندرہ رباعیاں ہوں گی۔

دو چار حمد و نعت میں، ایک دو اہل بیت کی مدح میں، چند

بادشاہ کی تعریف میں۔ صرف تین چار رباعیاں عشقیہ ہیں، وہ

بھی چمکی اور بے مزہ۔ یہی نہیں بلکہ ایک جگہ انہوں نے

رباعی کے وزن میں دھوکہ بھی کھایا ہے۔۔۔ غرض کہ شاعری کی وہ بلند سطح جو غالب کی غزلوں میں ملتی ہے، رباعیوں میں نظر نہیں آتی۔“ (۱۱)

اس حوالے سے غالب کی دور رباعیوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ غالب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رباعیوں کو غالب اور ظفر دونوں سے بہتر قرار دیتے ہیں اور مومن کی رباعیوں کے محاسن کو بیان کرتے ہوئے وہ اس حوالے سے مومن کو غالب اور ذوق پر فوقیت دیتے ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ میں انیس اور دہر کے کلام میں رباعیات کے معیار کو بیان کیا ہے اور مثالوں سے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مطلع نظریہ واضح کرنا ہے کہ غالب مومن اور انیس دہر کا عہد رباعی کے لیے بڑا سودمند ثابت ہوا کیونکہ:

”دلہوی شعرا کی بدولت عشقیہ مضامین میں تنوع اور تازگی پیدا ہوئی۔ لکھنوی شعراء کے ہاتھوں اخلاقی اور مصلحانہ طرز فکر سے رباعی روشناس ہوئی۔“ (۱۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ان ادوار میں رباعی کی پذیرائی اس طور ہوئی کہ وہ دوسرے اصناف شعر کے ہم مرتبہ ہو گئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مذکورہ تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے نورین فردوس لکھتی ہیں:

”فرمان صاحب کی اس کتاب میں تنقید کے ساتھ تحقیق بھی ملتی ہے اور غالب کے کلام اور زندگی کے بعض حقائق کا انکشاف بھی کرتی ہے۔“ (۱۳)

[۴]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک مقالہ ”پروفیسر حمید احمد خان اور مرزا غالب“ کے عنوان سے ”افکار“ کے حمید احمد خان ایڈیشن میں شائع ہوا۔ تنقیدی نوعیت کے اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حمید احمد خان کی غالب شناسی کے حوالے سے خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور غالب سے متعلق ان کے تعلق اور عقیدت کی اہمیت اور نوعیت کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح

پوری، حمید احمد خان کی خوبیوں کو گردانتے ہوئے ان کی وفات کو عظم و دانش کی دنیا کا ایک ناقابلِ حلافی سانحہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں بیسویں صدی میں اردو کے صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کا کلام بیسویں صدی کے قارئین کے لیے غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے۔ ایک غالب اور دوسرے اقبال۔ پروفیسر حمید احمد خان ان دونوں شعراء سے گہری عقیدت رکھتے تھے بلکہ غالب کے لیے یہاں تک کہتے ہیں:

”میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر میرے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔“ (۱۴)

غالب ششاسی کے حوالے سے حمید احمد خان کا سب سے منفرد کام ”نصوح حمید“ کی نئی ترتیب و تدوین اور تازہ اشاعت ہے (۲)۔ ”نصوح حمید“ کی اشاعت منطقی انوار الحق کی نگرانی میں ۱۹۴۱ء میں بمبئی سے ہوئی۔ گو کہ یہ اشاعت بڑی احتیاط و اہتمام سے کی گئی لیکن پھر بھی چند نکات پر اہل نظر متفق نہ تھے لیکن ان کے متعلق حتمی رائے وقت، محنت اور وقت نظر کی طالب تھی۔ حمید احمد خان نے ۱۹۳۸ء میں بمبئی کے کتب خانے میں بیٹھ کر ”نصوح حمید“ کے مطبوعہ اور قلمی نسخے کی ایک ایک طرح کا تفصیلی مطالعہ کیا اور پھر اس کی از سر نو ترتیب و تدوین کی اور حواشی اور مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ حمید احمد خان نے منطقی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں بیان کر دیا ہے کہ چند خیالات کی تردید کر کے ان کی منطقی وضاحت بھی کی ہے اور مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ساتھ ہی بہت سی کمزوریوں کا ازالہ کیا ہے جو منطقی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ”نصوح حمید“ میں حمید احمد خان نے اہل تحقیق کے لیے قابلِ توجہ سوالات اٹھائے ہیں اور ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے جن کی تفتیش غالب کے سلسلے میں بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ”نصوح حمید“ ”مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان کو منطقی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے پر فوقیت دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اردو زبان و ادب اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں پر پروفیسر حمید احمد خان کا ایسا احسان ہے جسے ادب کی تاریخ بھی بھلا نہیں سکتی۔“ (۱۵)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تنقید غالب کے سلسلے میں حمید احمد خان کے ایک اور منظر و مقالے ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“ کا حوالہ دیا ہے جو ابتدا فروری ۱۹۳۹ء میں ”ہمایوں“ (لاہور) میں شائع ہوا اور نظر جاتی کے بعد ”تنقید غالب کے سوسال“ (۱۶) میں چھپا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری (۱۷) کے مقالے کے بعد غالب پر دوسرا اہم تنقیدی مقالہ ہے لیکن عبدالرحمن بجنوری کے مقالے کے برعکس اس کی نوعیت جذباتی نہیں بلکہ سنجیدہ فحری کا حامل ہے۔ اس مقالے میں حمید احمد خان حسن و عشق کے باب میں غالب کے اشعار کو محقق و تنوع کا حامل قرار دیتے ہیں اور ان کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں

”اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شعراء میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگارنگ طلسات کے بندہ دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔“ (۱۸)

حمید احمد خان نے اپنے مقالے میں عکس رجحانی کے لیے جگہ جگہ اشعار و امثال کے مرقعوں سے اپنی بات کو قابل اعتبار بنایا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں حمید احمد خان نے نہ صرف غالب پر خود توجہ دی بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترفیب دی چنانچہ بحیثیت وائس چانسلر حمید احمد خان کی سرپرستی میں مجلس یادگار غالب نے تصانیف غالب اور اس کے علاوہ تنقید غالب کے سلسلے کی چار کتابیں شائع کیں جن میں ”تنقید غالب کے سوسال“ (۱۹)، ”غالب ذاتی مشاہدات کے آئینے میں“ (۲۰)، ”اشارہ غالب“ (۲۱) اور ”Ghalib, a Critical Introduction“ (۲۲) شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مذکورہ کتابوں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حمید احمد خان کی غالب سے دلچسپی کو سراہا ہے۔ حمید احمد خان کی نمایاں خدمات کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اگرچہ حمید احمد خان نے تعلیم انگریزی کی حاصل کی مگر محبت اردو سے کی اور مجلس ترقی ادب لاہور میں ناظم کی حیثیت سے اردو کلائسیکس کے سلسلہ اشاعت کو تیز کیا۔ اس کے علاوہ نہ صرف جشن غالب کے موقع پر اہم کتابیں شائع کیں بلکہ شدید مخالفت کے باوجود یونیورسٹی میں تاریخ ادبیات کا ایک شعبہ قائم کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حمید احمد خان کے انہی کارہائے نمایاں کا حوالہ دیتے ہیں اور خصوصاً تحقیق و تنقید غالب کے سلسلے میں ان کی خدمات کو اعلیٰ نظر کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رہنے کا موجب قرار دیتے ہیں۔

[۵]

”دیوان غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں“ کے زیر عنوان مقالہ ”نگار“ کے ”غالب نمبر“ جنوری فروری ۱۹۶۹ء کا ادوار یہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ”قومی زبان“ کراچی کی فروری ۱۹ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوا۔

عام طور پر لوگ دیوان حافظہ سے فال نکالتے تھے لیکن ڈاکٹر فرمان نے یہ کام دیوان غالب سے لیا ہے کیونکہ وہ عبدالرحمن بجنوری کی رائے:

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وہ مقدس اور دیوان

غالب۔ لوح سے قسمت تک مشکل سے سو صنفے ہیں لیکن کیا ہے

جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نقد ہے جو اس ساز زندگی کے

تاروں میں، بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔“ (۲۳)

کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہوئے غالب کے اس شعر کے مصداق قرار دیتے ہیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس نقطہ نظر کی بدولت یہ مقالہ ایک آپ جی اور ”دیوان غالب“ سے متعلق

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ذاتی تاثرات کا عکاس ہے۔

غالب کے جشن صد سالہ (۱۹۶۹ء) پر ڈاکٹر فرمان ”نگار“ کا ”غالب نمبر“ نکالنے کا

کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں غالب کی زندگی اور فن کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا

چکا تھا کہ ان کے متعلق کوئی تازہ اور کارآمد مضامین کا فراہم کرنا آسان نہ تھا چنانچہ انہوں نے اس

سلسلے میں غالب سے مشورہ لینے کی خاطر ”دیوان غالب“ سے فال نکالنے کا کام کیا اور یہ شعر

سامنے آیا:

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

جس سے گویا غالب نے ”غالب نمبر“ نکالنے کی ممانعت کر دی لیکن قارئین کے مطلوب

اور ”غالب نمبر“ نہ نکالنے کے سوا اس پر انہیں دوسرا اور فال نکالنے پر مجبور کیا مگر جواب بدستور ”نہ“

ہی ملا۔ پھر بعض لوگوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”نیاز صد حب ہوتے تو

ضرور اس موقع پر کچھ کرتے۔“ چنانچہ اس جملے نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لیے تازیانے کا کام دیا اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر ”دیوان غالب“ سے قال نکالی اور اس مرتبہ یہ شعر آیا:

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

گو پا جواب ثبت میں آیا۔ اس وقت صرف ایک ماورہ گیا تھا لیکن اس مختصر مدت میں نہ صرف ڈاکٹر فرمان کو ”نگار“ کے ”غالب نمبر“ کی انفرادیت کی پیشین گوئی ”دیوان غالب“ نے دی بلکہ مضامین کے انتخاب میں بھی رہنمائی کی جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یوں محسوس کیا:

”تیرے پاس تو غالب نمبر کا بڑا قیمتی ساز و سامان موجود ہے،

تو اس سلسلے میں بے حد پریشان ہے۔“ (۲۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ”دیوان غالب ہی کی بدولت انہیں ”روح غالب“ کے سامنے سرخرو ہونے اور پرستارِ غالب کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس طرح یہ مقالہ بالخصوص ڈاکٹر فرمان اور غالب کی قربت اور غالب سے ان کی محبت اور عقیدت کا ترجمان ہے۔

[۶]

”مولانا حامد حسن قادری مرحوم اور غالب شناسی“ کے زیر عنوان مقالہ ”نگار“ پاکستان کی نومبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ تنقیدی نوعیت کے حامل اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مولانا حامد حسن قادری سے اپنی شناسائی کا ذکر کیا ہے جو مراحل سے شروع ہو کر مکالمات اور پھر عقیدت مندی تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ”مولانا حامد حسن قادری کی ادبی خدمات کا“ اہمیت کہتا اور قلمیت بہتر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری مولانا حامد کی وضع دار اور شخصی اوصاف میں حاتی کی قربت کو بیان کرتے ہوئے بطور خاص مولانا حامد حسن قادری کی غالب شناسی کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں مولانا حامد، غالب کے شاگرد خاص مولانا الطاف حسین حالی سے بھی کئی اعتبار سے مماثلت رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بیسویں صدی میں غالب شناسی کا محرک حالی کی ”یادگار غالب“ (۱۸۹۷ء) ہے، وہاں مولانا حامد حسن قادری کی غالب شناسی کا یہ حال ہے کہ حالی کی مانند:

”غالب کا نام کیا آتا، گویا جام آجاتا اور ان کے ہاتھ کی سب
 نکیریں رنگ جاس جاتیں۔“ (۲۵)

اسی عقیدت کی بناء پر مولانا حامد نے غالب پر اس وقت قلم اُٹھایا جب ”یادگار غالب“ کے سوا اُردو انگریزی میں کوئی کتاب یا مقالہ وجود میں نہ آیا تھا۔ اس کے علاوہ غالیات کے حوالے سے مولانا جے غالب کے اُردو فارسی دیوان سے اشعار کا انتخاب بعنوان ”غالب“ کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں یہ قابلِ قدر کام ہے کیونکہ یہ انتخاب ”دیوان غالب“ کے اس نسخے سے کیا گیا تھا جو غالب کی وفات سے پانچ (۵) سال پہلے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا اور اس کے پروف بقول مولانا حامد حسن قادری خود غالب نے پڑھے تھے۔ (۲۶)

مذکورہ مقالے میں غالب اور کلام غالب سے مولانا حامد حسن قادری کی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ رباعی اور تاریخ گوئی پر مولانا کی توجہ خاص کے علاوہ مولانا حامد کی تفسیر نگاری کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں تفسیر نگاری کے ضمن میں مولانا حامد کی توجہ زیادہ تر غالب کی طرف رہی اور انہوں نے غالب کی بعض پوری غزلوں کی تفسیر کی ہے اور ایک ایک مصرع کی بجائے تین تین مصرع لگائے ہیں۔ پیش نظر مقالے میں چند مثالوں کو بطور حوالہ نقل کر کے کلام غالب کے سلسلے میں مولانا حامد کی تفسیر نگاری کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے کہ:

”یادگار غالب اور محاسن کلام غالب کے درمیانی عہد میں غالب
 شناسی اور غالب فہمی کا موثر ذریعہ خیال کی جاتی تھیں۔“ (۲۷)

مولانا حامد کی تفسیر نگاری کے بیان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاہ ولیکٹر، مدبر ”نقاد“ کا بھی حوالہ دیا ہے جنہوں نے مئی ۱۹۱۳ء کے پرچے میں مولانا حامد کی تفسیر نگاری کو سراہا۔

ذریعہ نظر مقالے میں مولانا حامد حسن قادری کا بطور غالب شناس یہ طرہ امتیاز بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں غالب پر جو لکھا گیا (بشمول شریں) ان کا بطور غائر مطالعہ کیا اور ان کے محبوب و محاسن پر بھی روشنی ڈالی لیکن وہ غالب کے طرف دار ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے کلام غالب سے زبان و معنی اور عروض و بیان کے معاصی کو بھی تلاش کیا ہے اور اس پر کڑی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہی وہ غالب کو قدیم غزل کے مجدد اور جدید غزل کا محسن قرار دیتے ہیں۔ (۲۸)

متعارفات

۔۔۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کی شناسائی کو فروغ
عام دینے میں کئی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔۔۔
ڈاکٹر انور سدید

۔۔۔ غالبیاتی ادب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک خاموش
خدمت، غالب شناسوں کے جواہر کو از سر نو سامنے لانا، گویا
”نایاب کو دستیاب“ بنانا بھی ہے۔ انہوں نے ”نگار“ کے
وسیلے سے نیاز فتح پوری، حسرت موہانی، یگانہ، ڈاکٹر خلیق اعظم،
صادقین اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کے غالب سے تعلق کی
قومیت اور اہمیت کو اجاگر کیا اور خوب کیا!
ڈاکٹر سید معین الرحمن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری جہاں تحقیق و تنقید کے ذریعے اپنے متعدد مقالات اور ادبی
نگارشات میں غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں، وہاں انہوں نے کئی غالب
شناسوں کے جواہر بھی متعارف کروائے ہیں اور اس مقصد کے لیے ”نگار“ ایک موثر ذریعہ ثابت
ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”نگار“ کے مختلف شماروں میں علامہ نیاز فتح پوری، مولانا حسرت
موہانی، میرزا ادا جہ حسین یاس و یگانہ چنگیزی، صادقین، آفتاب احمد خاں، مختار الدین احمد،
ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر ظہا انصاری اور شمس الرحمن فاروقی کے غالب سے تعلق کی قومیت اور اہمیت
کو واضح کیا ہے۔ یہاں یکجا ایسے ”متعارفات“ کو زیر بحث لانا بے گل نہ ہو گا۔

[۱]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ نیاز فتح پوری کی شرح دیوان غالب بعنوان "مشکلات غالب" کو نایاب سے دستیاب صورت دینے کی غرض سے اس کا نصف اول حصہ "نگار" اکتوبر ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں شائع کر دیا اور پھر "نگار" جنوری ۱۹۹۴ء کے شمارے کو اول الذکر شمارے کا ضمیر قرار دیتے ہوئے اسے "مشکلات غالب" کے بقیہ نصف حصے پر میلا کر دیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "مشکلات غالب" کی اہمیت دو خاص پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔

اول: اردو کے ایک عظیم شاعر غالب کے کلام کی شرح ہے۔

دوم: بیسویں صدی کے ایک عظیم نقاد کی ترجمان ہے۔ (۲۹)

اسی بناء پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے اس اقدام کو غالب اور نیاز دونوں کی تفہیم میں مددگار خیال کرتے ہیں۔

[۲]

مئی ۱۹۹۵ء کا "نگار" علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرت موہانی سے متعلق ہے۔ اس کی بنیادی وجہ مکی میں مولانا حسرت موہانی (۳۰) اور علامہ نیاز فتح پوری (۳۱) کی رحلت ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق یہ دونوں غالب کے شیدائی تھے اور دونوں نے کلام غالب کی شرح لکھی۔ اسی مناسبت سے مذکورہ شمارے میں مولانا حسرت موہانی (۳۲) اور علامہ نیاز فتح پوری (۳۳) دونوں کی شرحوں کے نمونے کے طور پر غالب کی متداول دیوان کی ۲۸ ویں غزل تک کی شرح کی گئی ہے۔ یہ شمارہ مولانا حسرت موہانی اور علامہ نیاز فتح پوری کی غالب فہمی کا عکاس ہے۔ یہ شمارہ حسرت، نیاز اور غالب سے ڈاکٹر فرمان کی محبت کا مظہر بھی ہے۔

[۳]

"نگار" جنوری ۱۹۹۴ء کا شمارہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز فتح پوری کے ایک مقالے "غالب کی فارسی شاعری" (تفصیلی مطالعہ دہاکہ) کے زیر عنوان شائع کیا ہے۔ یہ مقالہ غالب کی فارسی شاعری کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے خیال میں مذکورہ مقالہ فارسی شاعری میں غالب کے مقام و مرتبہ کو متعین کرتے ہوئے غالب کو اردو کے ساتھ ساتھ، فارسی کا بھی عظیم المرتبت اور موثر شاعر ثابت کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

”غالب کے اردو کلام کے حق میں جو کام ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مقالے ”محاسن کلام غالب“ نے کیا تھا، وہی کام غالب کے فارسی کلام کے سلسلے میں نیاز فتح پوری کے اس مقالے نے کیا۔“ (۳۳)

یہ مقالہ نیاز فتح پوری کی تنقیدی کتاب ”انتقادیات“ میں شامل ہے۔

[۳]

”نکاز“ کا ۱۹۸۷ء کا سالنامہ ”غالب نمبر“ مطالعات غالب سے متعلق نیاز فتح پوری کی تحریروں پر مشتمل ہے۔

غالب پر علامہ نیاز فتح پوری کی کوئی تالیف یا کتاب نہ ہونے کے باعث عام رائے یہ تھی کہ نیاز کو غالب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور اگر ہے بھی تو صرف اس قدر رکہ وہ غالب کو موسن سے کم تر درجے کا شاعر خیال کرتے تھے کیونکہ علامہ نیاز فتح پوری نے ۱۹۶۸ء میں ”نکاز“ کا موسن نمبر شائع کیا تو اپنے مقالے کا آغاز اس طور پر کیا:

”اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء حقد میں و محتاخرین کا کلام رکھ کر مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو بلا تامل کہوں گا کہ مجھے کلمات موسن دے دو اور باقی سب اٹھا کر لے جاؤ۔“ (۳۵)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مذکورہ غالب نمبر میں علامہ نیاز فتح پوری کے غالب سے تعلق خاطر کو ان کی مختلف تحریروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ ان میں ۱۹۳۲ء کا ”نکاز“، ”غالب کی شونیاں“ نمبر، اگست ۱۹۴۳ء کے ”نکاز“ میں شامل نیاز فتح پوری کا معرکہ آراء مضمون ”غفلت ہائے رنگ رنگ“ اور نیاز فتح پوری کی شرح دیوان غالب بعنوان ”مشکلات غالب“ شامل ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری کی غالب شناسی کے حوالے سے عام خیال اور مغالطے کو زور کرنے کی غرض سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”نکاز“ ۱۹۸۷ء (سالنامہ) ”غالب نمبر“ میں ان تحریروں کو محفوظ کر دیا جو غالب کے فکر و فن کے سلسلے میں نیاز فتح پوری نے لکھیں۔

[۵]

”نگار“ اپریل ۱۹۹۳ء کا شمارہ میرزا واجد حسین یاس و یگانہ چنگیزی سے متعلق ہے۔ یگانہ اردو غزل کی تاریخ میں یکسر منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور غزل میں ان کا لہجہ اور اسلوب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق سودا، آتش اور غالب کے لہجے کا سراغ دیتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”نگار“ کے مذکورہ شمارے میں یگانہ کی مشہور کتاب ”غالب شکن“ کے پہلے ایڈیشن کو شائع کیا ہے۔

”غالب شکن“ حقیقتاً اپنی ابتدائی صورت میں ایک قدرے طویل مخطوطہ جو ۱۹۳۳ء میں مسعود حسن رضوی کے نام یگانہ نے لکھا تھا، پھر ۱۹۳۳ء میں اسے چھوٹی تقطیع کے بتیس (۳۲) صفحات میں بصورت کتابچہ شائع کر دیا تھا۔

”غالب شکن“ کا دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔

ڈاکٹر نجیب جمال نے اس دوسرے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر اسے اپنے گراں قدر مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ اضافہ شدہ ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) دستیاب ہے لیکن پہلا ایڈیشن چونکہ بہتوں کی نظر سے ہنوز ادھمبھل ہے، چنانچہ اس ایڈیشن کو عام کرنے کی غرض سے ”نگار“ کے اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارے میں پہلے ایڈیشن کی فوٹو کاپی ڈاکٹر نجیب جمال کے تفصیلی مضمون کے ساتھ شائع کی گئی تھی، جو میرزا واجد حسین یاس و یگانہ چنگیزی کی غالب پر تحقیق و تنقید کی نوعیت کو واضح کرتی ہے۔

[۶]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”نگار“ فروری ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں ”غالب کی شرحیں“ کے عنوان سے آفتاب احمد خاں کے مضمون کو متعارف کروایا ہے۔

مذکورہ مضمون میں آفتاب احمد خاں نے غالب کے اس اذکار

”غلبہ“ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آدے

کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہوئے اس کے جواز میں ”یو یوان غالب“ کی شرح نویسی کا حوالہ دیا ہے۔ شرح نویسی کا یہ سلسلہ حیات غالب سے لے کر آج تک قائم ہے۔ غالب کی کمال یا جزوی شرحوں کے حوالے سے آفتاب احمد خاں نے پچاس سے زائد شرحوں اور ان کے شارحین کے نام

اپنے مقالے میں درج کیے ہیں۔ اس حوالے سے مقالہ نگار نے کلام غالب پر ایسی تنقیدات کا بھی حوالہ دیا ہے جو دیوان غالب کی منظوم شرح کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ”وسب زرفقاں“ پر تبصرے کا حوالہ دیا گیا ہے کہ

”صبا کبرآبادی نے بھی دیوان غالب کی مکمل تصمین کی ہے لیکن یہ ابھی طباعت و اشاعت کی منتظر ہے۔“ (۳۶)

[۷]

”نگار“ پاکستان کا اکتوبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ ملا۔ انصاری اور محسن الرحمن فاروقی کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں غالب پر ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون ”دشمنان غالب اور غالب“ بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری تفہیم و تحقیق غالب کے سلسلے میں کئی اعتبار سے فکر انگیز اور توجہ طلب قرار دیتے ہیں۔ اردو ادب میں چونکہ بہت پرستی کی روایت عام ہے اور غالب کے سلسلے میں بھی مروج ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس روایت کے قائل نہیں۔ وہ حقائق کو سامنے لانے پر زور دیتے ہیں اور اسی حوالے سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے مضمون کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں

”ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب نے پہلی بار اس طرف توجہ کی ہے اور قہایت مدلل انداز میں اہل نقد و نظر کو کم سے کم غالب کے سلسلے میں راہ اعتدال اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔“ (۳۷)

”نگار“ کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر فرمان نے محسن الرحمن فاروقی کا مضمون ”انداز گھٹکد کیا ہے؟“ شامل ہے اور ساتھ ہی اپنے مضمون ”کلام غالب میں استفہام“ کو بھی اسی شمارے میں شامل کیا کیونکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں غالب پر محسن الرحمن فاروقی کے مذکورہ مضمون اور ”کلام غالب میں استفہام“ کے درمیان تو اور بڑی ہی کیفیت پیدا ہو گئی ہے (۳۸) اس مباحثہ کے پیش نظر عاصم اعجاز نے بھی اس سکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ

”محسن الرحمن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک معروف مقالے ”غالب کے کلام میں استفہام“

(مطبوعہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر چڑھا لطف

اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔“ (۳۹)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور عاصمہ اعجاز کی اس رائے کی تائید ڈاکٹر سید معین الرحمن نے بھی کی ہے (۴۰) چنانچہ ڈاکٹر فرمان نے اسی نکتے کے جواز میں اپنے اور شمس الرحمن فاروقی کے مضمون کو مذکورہ شمارے میں ایک ساتھ شائع کیا ہے۔

[۸]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”نگار“ پاکستان کی اپریل ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں ڈاکٹر اسلم پرویز کی کتاب ”بہادر شاہ ظفر“ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی کو متعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں یہ کتاب بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور شاہی کو سبیل مرتبہ پوری آب و تاب اور صداقت و حقائق کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی زندگی غالب سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔ اس تعلق کو بھی مذکورہ تصنیف میں بیان کیا گیا ہے۔ غالب، بہادر شاہ ظفر کے استاد و توفیق کی وفات کے بعد ہوئے لیکن قلعہ معلی سے ان کا تعلق اس سے پہلے ہی قائم تھا۔

۱۲ دسمبر ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفر نے غالب کو ”نظم الدولہ، دہر الملک، نظام جنگ کے خطابات عطا کیے اور باقاعدہ ملازمت دے کر انہیں فارسی زبان میں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا۔ ۱۸۵۳ء میں ذوق کے انتقال کے بعد شاہ ظفر، مرزا غالب سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا جس کے بعد بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون بھیج دیئے گئے۔ (۴۱)

ڈاکٹر اسلم پرویز نے ”بہادر شاہ ظفر“ کے اساتذہ کے ضمن میں یہ واضح کیا ہے کہ ظفر کی شاعری پر شاہ نصیر، ذوق اور غالب کا اثر نسبتاً زیادہ تھا اور انہی اثرات نے ظفر کے خالقِ سخن کو نکھارا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ڈاکٹر اسلم فرغی کی تصنیف ”بہادر شاہ ظفر“ کو متعارف کروانے کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظفر اور غالب کے تعلق کے حوالے سے غالب کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

[۹]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ”نگار“ پاکستان کی فروری ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں محقّرالدین احمد کے بارے میں اہم معلومات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب میں محقّرالدین احمد کی ایک وجہ شہرت بطور غالب شناس بھی بتائی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر مالک رام کی مرتبہ کتاب ”نذرِ بختاز“ سے مقالات کا انتخاب بھی کیا گیا ہے جن میں سے ”تصنیف و تالیف“ کے زیر عنوان محقّرالدین احمد کی تصنیف میں غالب پر ان کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

غالب سے متعلق ان کے اوپی، علمی اور تحقیقی مضامین ”غالب نامہ“ کی زینت بنے۔ اس کے علاوہ محقّرالدین احمد نے بعض رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں جن میں مالک رام نے ”علی گڑھ میگزین“ ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء کے ”غالب نمبر“ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے (۳۲) جس کو بعد ازاں حذف و اضافے کے ساتھ ”احوال غالب“ اور ”نقد غالب“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

مالک رام کی مرتبہ ”نذرِ بختاز“ کے علاوہ اُسلوب احمد انصاری بھی ”نگار“ کے مذکورہ شمارے میں شامل اپنے مضمون ”محقّرالدین احمد: ایک دوست“ میں ان کا ذکر بطور غالب شناس کرتے ہیں اور محقّرالدین احمد کی تصنیف ”احوال غالب“ میں غالب کے معرکتہ آراء خاکے کو ایک تحقیق کا وجہ دیتے ہیں (۳۳)۔

مندرجہ بالا مضمولات کے پیش نظر ”نگار“ پاکستان کا فروری ۱۹۸۹ء کا شمارہ محقّرالدین احمد کے حوالے سے بہت سی مفید معلومات کے ساتھ ان کی غالب شناسی کا احاطہ کرتا ہے۔

[۱۰]

”نگار“ جولائی ۱۹۹۲ء کا ادارہ ”تصوف اور غالب“ کے عنوان سے ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کے کلام میں تصوف کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے سید محمد مصطفیٰ صابری کی تصنیف ”غالب اور تصوف“ کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے اور ساتھ ہی اس شمارے میں اس تصنیف کے چند اجزاء کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

غالب کی انفرادیت یہ ہے کہ غالب شناسی کا سلسلہ حیات غالب سے تاحال جاری ہے بلکہ نیا وہ جوش و خروش سے رواں دواں ہے۔ اس کی وجہ بلاشبہ غالب کی شخصیت اور شاعری

کے حیرت انگیز نکات درموز ہیں۔ البتہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے اس اذکار:

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ پادہ خوار ہوتا

کی جانب سے بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ان کی نظر میں تصوف کے حوالے سے سید محمد مصطفیٰ صابری کی کتاب ”غالب اور تصوف“ قابل ستائش ہے۔ اس تصنیف کی اہمیت وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

”صابری صاحب تصوف اور شاعری دونوں کے شہاورد معلوم ہوتے ہیں۔ تبھی انہوں نے اپنے موضوع سے ہر طرح انصاف کیا ہے اور غالب آگاہی کے ساتھ ساتھ تصوف کا ثبوت بھی دیا ہے۔“ (۳۳)

گویا ”نگار“ کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سید محمد مصطفیٰ صابری کے غالب سے تعلق کی نوعیت کو متعارف کروایا ہے۔

[۱۱]

”نگار“ کا فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے کا ادارے ”غالب کے خطوط“ کے عنوان سے ہے جس میں غالب کو عظیم شاعر کے ساتھ عظیم نثر نگار بھی بتایا گیا ہے۔ غالب کی نثر جو ان کے خطوط پر مشتمل ہے، انہیں اردو کی عام نثری تاریخ میں بحیثیت صاحب طرز نثر نگار نہایت بلند و ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کی ترتیب و تدوین کی طرف بہت سے اہل علم نے توجہ دی۔ ان میں ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ ”غالب کے خطوط“ کے تنقیدی ایڈیشن کا تعارف کروایا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا تعارف اور ان کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحقیق و تنقید دونوں میں ان کے قلم کو رتبہ اعتبار دیتے ہیں اور دو موضوعات کو ان کی خاص دلچسپی کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ایک غالب اور دوسرے فنی تنقید۔ ان دونوں دلچسپیوں کا بھرپور اظہار ڈاکٹر خلیق انجم نے ”غالب کے خطوط“ کے تنقیدی ایڈیشن میں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس میں غالب کے خطوط کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس ادارے میں غالب کے خطوط کے پہلے ایڈیشنوں کی

خصوصیات اور ان کے مشمولات کا ذکر کیا ہے اور پھر ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ تنقیدی ایڈیشن کے امتیازات کو نمایاں کر کے ان کی انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔

خطوط غالب کی ترتیب و تدوین کا یہ کام ڈاکٹر خلیق انجم نے کم و بیش پانچ پانچ سو صفحات کی چار ضخیم جلدوں میں مکمل کیا ہے، اس کی جلد اول کے متعلق ڈاکٹر فرمان نکلستے ہیں۔

”جلد اول کا تحقیقی و تنقیدی مقدمہ سوا دو سو صفحات پر مشتمل

ہے گویا ”خطوط غالب“ پر ایک مکمل کتاب ہے۔“ (۳۵)

”نگار“ کے اس شمارے میں ڈاکٹر فرمان نے ”غالب کے خطوط“ مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،

جلد اول کے مقدمے کا صرف ایک جز متعارف کروایا ہے جس کا تعلق خطوط غالب کے مختلف ایڈیشن، املا کی خصوصیات اور بعض الفاظ کے استعمال سے ہے۔

مذکورہ مشمولات کے پیش نظر ”نگار“ فروری ۱۹۸۸ء کا شمارہ بلاشبہ ڈاکٹر خلیق انجم کی

غائب شناسی کا احراز اور عکاس ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ ”غالب۔ نو دریافت بیاض کی روشنی میں“، مشمولہ ”نقوش“، غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، سال ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۔
- ۲۔ ”یا وگا ر غالب“، ص ۱۳۶، مطبوعہ مکتبہ عالیہ، لاہور۔
- ۳۔ ”ذکر غالب“، ص ۴۰۔
- ۴۔ ”دیباچہ نسخہ مرثی“، ص ۱۳۔
- ۵۔ خط بنام بلگرامی مشمولہ ”خطوط غالب“، مرتب غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی ایڈسنز، ص ۳۶۰۔
- ۶۔ ”غالب۔ نو دریافت بیاض کی روشنی میں“، ”مشمولہ“ ”نقوش“، غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، سال ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۔
- ۷۔ ایضاً ص ۴۶۔
- ۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ ”ایک تاثر“، مقالہ نگار کمال احمد صدیقی (دہلی) مشمولہ ڈاکٹر فرمان

- ۱۔ پوری (حیات و خدمات)، ترتیب دتہ وین امر اڈ طارق، جلد سوم، ص ۲۳۱۔
- ۹۔ "دانش ہائے رنگ رنگ"، مضمونہ "نگار" مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۵۵۔
- ۱۰۔ ایضاً ص ۵۶۔
- ۱۱۔ "آردور ہائی"، ص ۸۱، مطبوعہ مکتبہ عالیہ، لاہور۔
- ۱۲۔ ایضاً
- ۱۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور محقق "مقالہ نگار نورین فردوس، ۱۹۹۱ء، (غیر مطبوعہ)، ص ۶۲۔
- ۱۳۔ "نسخہ حمید یہ" مرتبہ حمید احمد خان، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔
- ۱۵۔ "حمید احمد خان اور مرزا غالب"، مضمونہ "افکار"، ۱۹۷۰ء، ص ۶۵۔
- ۱۶۔ "مطبوعہ" مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء۔
- ۱۷۔ "محاسن کلام غالب"، مضمونہ "تحقید غالب کے سو سال"، ص ۱۲۳-۱۵۳۔
- ۱۸۔ "حمید احمد خان اور مرزا غالب"، مضمونہ "افکار"، ص ۶۷-۱۹ء۔
- ۱۹۔ مرتبہ فیاض محمود اور اقبال حسین، ۱۹۶۹ء۔
- ۲۰۔ مرتبہ عبدالشکور احسن اور سیاد باقر رضوی، ۱۹۶۹ء۔
- ۲۱۔ از سید مصین الرحمن، ۱۹۶۹ء۔
- ۲۲۔ از سید فیاض محمود، ۱۹۶۹ء۔
- ۲۳۔ "محاسن کلام غالب"، مضمونہ "تحقید غالب کے سو سال"، ص ۱۲۳۔
- ۲۴۔ "دیوان غالب سے قال نکال سکتے ہیں" مضمونہ "نگار" غالب نمبر، جنوری و فروری ۱۹۶۹ء، ص ۵۔
- ۲۵۔ "نگار" پاکستان نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۔
- ۲۶۔ "نگار" پاکستان نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۔
- ۲۷۔ "نگار" پاکستان نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۔
- ۲۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بعض دوسری تحریروں کے لیے رجوع کیجیے:
- (الف) غالب، ایک کم نام قلمیہ: "افکار نو" کراچی فروری ۱۹۶۱ء۔
- (ب) غالب و مریدہ ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء۔
- (ج) غالب کی ایک غزل کے بارے میں اشتہار کا جواب، "نگار" کراچی،

مارچ ۱۹۶۸ء۔

۳۹۔ ”ملاحظات“، نگار، اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص ۲۔

۳۰۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء،

۳۱۔ ۲۳ مئی ۱۹۶۶ء،

۳۲۔ ”شرح، یہ آپ غالب“

۳۳۔ ”ملاحظات غالب“

۳۴۔ ”نگار“ جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۶۔

۳۵۔ ”ملاحظات“، ”نگار“ نومبر ۱۹۸۷ء (سالنامہ) غالب نمبر

۳۶۔ ”کلام غالب کی شرحیں“ مضمون نگار: آفتاب احمد خاں، مشمولہ ”نگار“ فروری ۱۹۹۷ء،

ص ۱۶

۳۷۔ ”نگار“ اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۷

۳۸۔ ”نگار“ اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۵

۳۹۔ ”غالب نامہ“ تجزیاتی مطالعہ تحفیس، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۳ء

۴۰۔ ”ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی“ مشمولہ ”نقوش غالب“ از سید معین الرحمن،

ص ۲۵۹

۴۱۔ ”نگار“ اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۲۲

۴۲۔ ”نگار“ پاکستان فروری ۱۹۸۹ء، ص ۳۳

۴۳۔ ”نگار“ پاکستان فروری ۱۹۸۹ء، ص ۶۴

۴۴۔ ”ملاحظات“ مشمولہ ”نگار“ شمارہ جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۴

۴۵۔ ”ملاحظات“ مشمولہ ”نگار“ فروری ۱۹۸۸ء، ص ۴۔

عاصمہ وقار

غالبیاتِ فرمان کا اشاریہ

(۱۹۵۲-۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ولادت ۳۶ جنوری ۱۹۲۶ء) کا غالب کے بارے میں پہلا مضمون ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا، تو وہ چھبیس (۲۶) برس کے تھے۔ اب کہ وہ مجھہ عمر عزیز کی بہتر منزل میں طے کر چکے ہیں، غالب پر ان کے ستر کے لگ بھگ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان کے یہ علمی مضامین متعدد جگہ شائع ہوئے یا انتخابات میں لیے گئے۔ ان سب اشاعتوں کا شمار کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ستر (۷۰) کے قریب مضامین ایک سو پچاس کے قریب رسائل و جرائد یا کتب میں شامل اور شائع ہوئے۔ پڑھنے والوں کی ایک سے زیادہ نسلوں پر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۷ء تک کے برسوں میں فرمان فتح پوری کی ان تحریروں نے جو اثرات مرتب اور غرور تم کیے ہوں گے، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

ذیل میں غالب سے متعلق ان کے مضامین کا ایک اشاریہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اشاریہ سازی کی یہ خدمت میں نے ڈاکٹر سید معین الرحمن کی رہنمائی میں انجام دی۔ یہ سارے حوالے مجھے گمرہ میں ابو کے ذخیرہ غالبیات میں ملے۔ کچھ حوالے ایسے ہوں گے جن تک، تو کے ذخیرے میں نہ ہونے کے باعث میری رسائی نہ ہو سکی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کچھ مزید حوالے یا تراشے ڈاکٹر سید معین الرحمن کے کتاب خانے میں ہوں، لیکن میری نظر سے رہ گئے ہوں۔

اس "عرض مرتب" کے بعد غالب کے بارے میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۷ء تک کی زمانی حد میں چھپنے والی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریروں کا سال بہ سال گوشوارہ ملاحظہ ہو

[۱۹۵۲ء-۱۹۶۰ء]

- ۱۔ کلام غالب میں استفہام
- ۱۔ نگار بکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء
- ۲۔ تحقیق و تنقید، کراچی، ۱۹۶۳ء
- ۳۔ نگار، کراچی، مئی ۱۹۶۹ء
- ۴۔ تنقید غالب کے سوسال (فیاض محمود)، لاہور، ۱۹۶۹ء
- ۵۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۶۔ نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۰ء
- ۷۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
- ۸۔ ادیب، علی گڑھ، جنوری ۱۹۹۲ء
- ۹۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
- ۱۰۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار (ڈاکٹر سلیم اختر)، لاہور، ۱۹۹۸ء
- ۲۔ مکمل شرح دیوان غالب پر ایک نظر
- ۱۔ نگار بکھنؤ، جولائی ۱۹۵۳ء
- ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۳۔ غالب کے مقطعات
- ۱۔ ساقی، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء
- ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۳۔ غالب اور اقبال
- ۱۔ نگار بکھنؤ، دسمبر ۱۹۵۵ء
- ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۳۔ نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
- ۴۔ نگار، کراچی، سالانہ دسمبر ۱۹۹۰ء
- ۵۔ غالب اور اقبال (۲)
- ۱۔ نگار بکھنؤ، مئی ۱۹۵۶ء
- ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۳۔ نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
- ۴۔ نگار، کراچی، سالانہ دسمبر ۱۹۹۰ء

- ۶۔ غالب کے اسلوب سخن کا ایک پہلو طنز ۱۔ نگار، ٹکسنو، مارچ ۱۹۵۷ء
 ۲۔ نگار، ٹکسنو، اکتوبر ۱۹۵۷ء
 ۳۔ نگار، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
 ۴۔ غالب، شاعر امر و زو فر واد، لاہور، ۱۹۷۰ء
 ۵۔ نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۰ء
 ۶۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
 ۷۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء

[۱۹۶۱ء-۱۹۶۸ء]

- ۷۔ غالب کا ایک گم نام قطعہ ۱۔ انکار، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء
 ۸۔ غالب کا نفسیاتی مطالعہ ۱۔ نگار، ٹکسنو، نومبر ۱۹۶۱ء
 ۲۔ (کافر نے بد) فروغ احمد، ٹکسنو، غالب نمبر ۱۹۶۸ء
 ۳۔ غالب، شاعر امر و زو فر واد، لاہور، ۱۹۷۰ء
 ۹۔ اقبال اور غالب کا تقابلی مطالعہ ۱۔ نگار، ٹکسنو، جنوری ۱۹۶۲ء
 ۲۔ غالب، شاعر امر و زو فر واد، لاہور، ۱۹۷۰ء
 ۳۔ نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء
 ۴۔ نگار، کراچی، سالانہ نمبر ۱۹۹۰ء
 ۱۰۔ رباعی کا ایک اہم ذور: غالب و انیس ۱۔ اردو رباعی، طبع اول، کراچی ۱۹۶۲ء
 ۲۔ اردو رباعی، طبع دوم، لاہور، ۱۹۸۲ء
 ۱۱۔ جدید اردو غزل: غالب سے حالی تک ۱۔ نگار، کراچی، جولائی اگست ۱۹۶۵ء
 ۱۲۔ غالب اور دوسرے مضامین ۱۔ نگار، کراچی، ۱۹۶۶ء
 (نظیر حسین زیدی)
 ۱۳۔ جہان غالب (کوثر چاند پوری) ۱۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء
 ۱۴۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی ۱۔ نگار، کراچی، نومبر ۱۹۶۶ء
 ۲۔ سیپ، کراچی، شمارہ ۸، ۱۹۶۶ء
 ۳۔ باضافہ ادبیات و شخصیات، لاہور، ۱۹۹۳ء

- ۱۵۔ غالب نقشِ ہائے رنگ رنگ - ۱۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۷ء
- ۱۶۔ احوال و تہذیب غالب (حیات سیال) - ۲۔ ہماری زبان، دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء
- ۱۷۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب (شادان بلکرائی) - ۱۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء
- ۱۸۔ غالب سے متعلق ایک خط اداس کا جواب - ۱۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء
- ۱۹۔ غالب و سرسید - ۱۔ ہماری زبان، دہلی، ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء
- ۲۰۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز - ۱۔ ہماری زبان، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۸ء
- ۲۱۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز - ۲۔ قومی زبان، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء
- ۲۲۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز - ۳۔ ہندوستانی ادب، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۶۹ء
- ۲۳۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء - ۳۔ سورج، لاہور، ۱۹۹۶ء
- ۲۴۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء - ۵۔ سورج، لاہور، ۱۹۹۶ء
- [سال غالب ۱۹۶۹ء]
- ۲۱۔ غالب نسخہ حمید پیکر روشنی میں - ۱۔ ماہ نو، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
- ۲۲۔ غالب کے اولین تحارف نگار - ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۲۳۔ غالب کے اولین تحارف نگار - ۱۔ آردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء
- ۲۴۔ غالب کے اولین تحارف نگار - ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۲۵۔ غالب کے اولین تحارف نگار - ۳۔ سورج، لاہور، ۱۹۹۶ء
- ۲۶۔ دیوان غالب سے قال - ۱۔ ادارہ نگار، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
- ۲۷۔ غالب کے حالات میں (بعد وفات) - ۲۔ قومی زبان، کراچی، فروری ۱۹۸۱ء
- ۲۸۔ غالب کے حالات میں (بعد وفات) - ۱۔ اعلم، کراچی، جنوری - جون ۱۹۶۹ء
- ۲۹۔ غالب کے حالات میں (بعد وفات) - ۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۳۰۔ غالب اور تنقید: معنی کا طلسم - ۱۔ نقوش، لاہور، غالب نمبر ۱، ۱۹۶۹ء
- ۳۱۔ غالب اور تنقید: معنی کا طلسم - ۲۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۹ء

- ۲۶۔ غالب، شاعر امروز و فردا
۱۔ شاعر، بمبئی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء
۲۔ ہمد و محنت، کراچی، جون ۱۹۶۹ء
۳۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۴۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
۵۔ اے کاش کبھی۔۔ (میں اور غالب) ۱۔ غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں (شکوہ حسن)، لاہور، ۱۹۶۹ء
۲۔ راوی، لاہور، غالب نمبر، اپریل ۱۹۶۹ء
۳۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۴۔ محفل، مجلہ اسلامیہ کالج برائے خواتین، کوہر روڈ لاہور، ۱۹۷۰ء
۵۔ جزو آویزاں، کتاب ”تمنا کا دوسرا قدم اور غالب“، ۱۹۹۵ء
۲۸۔ فلسفہ کلام غالب (شوکت بزداری)
۲۹۔ غالب ڈائری یو پی ایل،
۳۰۔ غالب اور مطلقہ غالب (عبادت بریلوی)
۳۱۔ نذر غالب (عطاء الرحمن کا کوئی)
۳۲۔ پنجمہ دل آشوب: سلسلہ غالبیات (قدرت نقوی)
۳۳۔ محاسن کلام غالب (بجنوری)
۳۴۔ صحیفہ، غالب نمبر-۳
۳۵۔ غالب اور غالب تحفوں کے دوسرے شعراء ۱۔ صحیفہ، لاہور ماکتوبر ۱۹۶۹ء
۲۔ غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء

[۱۹۷۰ء-۱۹۶۹ء]

- ۳۶۔ شیخ آہنگ غالب (مرتبہ زیر اہم علمدی) اردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۷۰ء
۳۷۔ غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر ۱۔ ماہنامہ، کراچی، فروری ۱۹۷۰ء

۲۔ کتاب سے پہلے، غالب شاعر امروز و فردا،
لاہور، ۱۹۷۰ء

۳۔ ماچو، جنوری فروری، ۱۹۹۸ء

۳۸۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور غالب ۱۔ انکار، کراچی، شمارہ ۵۰، سال ۱۹۷۰ء

۲۔ ادبیات و شخصیات، لاہور، ۱۹۹۳ء

۳۹۔ اشاریہ غالب (سید معین الرحمن)

۴۰۔ دیوان غالب نوحہ حمیدیہ (حمید احمد خان)

۳۱۔ غالب کون؟ (سید قدرت نقوی)

۳۲۔ نقوش، غالب نمبر ۲ (محمد ظلیل)

۳۳۔ غالب، نو دریافت، بیاض کی روشنی میں ۱۔ نقوش، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۰ء

۲۔ نیا اور پُرانا ادب، کراچی، ۱۹۷۳ء

۳۴۔ ادبِ لطیف، غالب نمبر (ناصر زیدی)

۳۵۔ غالب اور انقلاب ستاروں
(ڈاکٹر سید معین الرحمن)

۳۶۔ کہا دیوان غالب لائق امروز و ہدایتی ۱۔ غالب، کراچی، سالنامہ ۷۷-۷۸-۷۹ء

۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء

۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، ۱۹۹۵ء

۳۷۔ تحقیق غالب (ڈاکٹر سید معین الرحمن) ۱۔ قلیپ، مطبوعہ کراچی، ۱۹۸۱ء

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شمس (حمید)

افصح وحید، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۴ اور ص ۲۱۷

۳۸۔ ”سوویت جائزہ“ (غالب کی مقبولیت) ۱۔ نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۸۶ء

۲۔ نگار، کراچی، فروری ۱۹۹۷ء

۳۹۔ غالب اور صداقت کی یاد میں

۱۔ سالنامہ نگار، کراچی، نومبر ۱۹۸۷ء

۲۔ غالب فن و شخصیت (نیاز فتح پوری)

مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۸۷ء

۵۰۔ غالبیاتی مطالعات نیاز:

- ۵۱۔ غالب کے خطوط (ڈاکٹر خلیق انجم)
نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۸ء
- ۵۲۔ (غالب کے معاصر) بہادر شاہ ظفر
(ڈاکٹر اسلم پرویز)
نگار، کراچی، مارچ ۱۹۸۸ء

- ۵۳۔ غالبیات طہ نصاریٰ و خورشید الرحمن قادری
نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
- ۵۴۔ (غالب دوست) مختار الدین احمد کی نذر
نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۹ء

[۱۹۹۱ء-۱۹۹۸ء]

- ۵۵۔ ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک ۱۔ سالنامہ صریح، کراچی، ۱۹۹۱ء
اور غالب ۲۔ غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۲ء
- ۳۔ نگار، کراچی، نومبر ۱۹۹۳ء
- ۴۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
- ۵۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
- ۵۶۔ غالب کی فارسی غزل (نیاز فتح پوری)
نگار، کراچی، جنوری ۱۹۹۲ء
- ۵۷۔ غالب اور تصوف (محمد مصطفیٰ صابری)
نگار، کراچی، جولائی ۱۹۹۲ء
- ۵۸۔ مشکات، غالب (۱) (نیاز فتح پوری)
نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۳ء
- ۵۹۔ مشکات، غالب (۲) (نیاز فتح پوری)
نگار، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء
- ۶۰۔ کلام غالب میں لفظ "تمنا" کی تکرار ۱۔ اوراق، خاص نمبر ۱۵، ستمبر ۱۹۹۳ء
- ۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
- ۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
- ۶۱۔ غالب کی شاعری اور مسائل تصوف ۱۔ سالنامہ صریح، کراچی، جون جولائی ۱۹۹۳ء
- ۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
- ۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
- ۶۲۔ غالب کے اشعار جدید اردو شاعری پر ۱۔ سماجی تنقید، کراچی، جون ۱۹۹۳ء
- ۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
- ۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
- ۶۳۔ غالب چمن (پانچواں/نہج جمال)
نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۳ء

- ۶۳۔ نیکو حمید یہ سے چندا شعائر
قننا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء
- ۶۵۔ شاعر حسین غالب۔ حسرت اور نیاز
نگار، کراچی، مئی ۱۹۹۵ء
- ۶۶۔ دیوان غالب کی ابتدائی پانچ غزلیں:
فردا، بھلے، گورنمنٹ کالج مری، جون ۱۹۹۷ء
- تشریح و توضیح
- ۶۷۔ غالب کی دو غزلوں کی شرح
تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء
- ۶۸۔ شرح دیوان غالب: کیوں اور کیسے؟
تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء

مآخذ

غالب سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نگارشات کے اس اشاریے کی ترتیب و تیاری میں مجھے درج ذیل مآخذ سے مدد ملی ہے۔

کتابیں

- ۱۔ ادبیات و شخصیات، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، ۱۹۹۳ء
- ۲۔ اردو رہائی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۶۲ء
- ۳۔ تحقیق غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمن، کراچی، ۱۹۸۱ء
- ۴۔ تحقیق و تنقید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۶۳ء
- ۵۔ قننا کا دوسرا قدم اور غالب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۹۵ء
- ۶۔ تنقید غالب کے سوسال، مرتبہ: فیاض محمود، اقبال حسین، لاہور، ۱۹۶۹ء
- ۷۔ غالب، ذاتی تاثرات کے آئینے میں، مرتبہ: شکور حسن، سجاد باقر رضوی، لاہور، ۱۹۶۹ء
- ۸۔ غالب، شاعر امر و فردا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، ۱۹۷۰ء
- ۹۔ غالب شناسائی اور نیاز و نگار، مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور، ۱۹۹۸ء
- ۱۰۔ غالب فن و شخصیت، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۸۷ء
- ۱۱۔ نقوش غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمن، لاہور، ۱۹۹۵ء
- ۱۲۔ نیاز اور پرانا ادب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۷۳ء

رسائل و جرائد

- (۱) ادیب، علی گڑھ، جنوری جون ۱۹۹۳ء
- (۲) آرزو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء، جنوری مارچ ۱۹۷۰ء
- (۳) انکار، کراچی، شمارہ ۵۶، ۵۷، ۱۹۷۰ء (۴) انکار نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء
- (۵) العلم، کراچی، جنوری جون ۱۹۶۹ء (۶) اوراق، لاہور، خاص نمبر، ۱۹۹۳ء
- (۷) تحقیق نامہ، لاہور، شمارہ ۳-۳، سال ۹۵-۱۹۹۳ء (۸) شمارہ ۶، سال ۱۹۹۸ء
- (۸) تشیل، کراچی، جون ۱۹۹۳ء (۹) راوی، لاہور، اپریل ۱۹۶۹ء
- (۱۰) ساقی، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء (۱۱) سورج، لاہور، اپریل مئی ۱۹۹۶ء
- (۱۲) سیپ، کراچی، شمارہ ۸، سال ۱۹۶۶ء (۱۳) شاعر، بمبئی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء
- (۱۳) بھینٹ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء
- (۱۵) صریح، کراچی، سالنامہ ۱۹۹۱ء، جون جولائی ۱۹۹۳ء
- (۱۶) غالب، کراچی، سالنامہ ۷۷-۱۹۷۶ء (۱۷) غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۳ء
- (۱۸) فردا، مری، جون ۱۹۹۷ء
- (۱۹) فروغ آرزو، کھنڈ، غالب نمبر ۱۹۶۸ء
- (۲۰) قوی زبان، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء، فروری ۱۹۸۱ء
- (۲۱) ماہو، کراچی، لاہور: جنوری فروری ۱۹۶۹ء، فروری ۱۹۷۰ء
- (۲۲) جنوری فروری ۱۹۹۸ء
- (۲۳) عمل، کوہ روڈ لاہور، ۱۹۷۲ء
- (۲۳) نقوش، لاہور: غالب نمبر ۱، ۱۹۶۹ء، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء
- (۲۳) نگار، کھنڈ مئی ۱۹۵۲ء، جولائی ۱۹۵۳ء، دسمبر ۱۹۵۵ء، مئی ۱۹۵۶ء، مارچ ۱۹۵۷ء
- (۲۴) اکتوبر ۱۹۵۷ء، نومبر ۱۹۶۱ء، جنوری ۱۹۶۲ء
- (۲۵) نگار، کراچی: جولائی اگست ۱۹۶۵ء، جنوری ۱۹۶۶ء، اکتوبر ۱۹۶۶ء، نومبر ۱۹۶۶ء
- (۲۵) مارچ ۱۹۶۷ء، ستمبر ۱۹۶۷ء، مارچ ۱۹۶۸ء، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
- (۲۵) مئی ۱۹۶۹ء، جون ۱۹۶۹ء، اگست ۱۹۶۹ء، ستمبر ۱۹۶۹ء، اکتوبر ۱۹۶۹ء
- (۲۵) مئی جون ۱۹۷۰ء، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء، جولائی اگست ۱۹۷۱ء
- (۲۵) جنوری فروری ۱۹۷۵ء، نومبر دسمبر ۱۹۷۵ء، اگست ۱۹۸۶ء
- (۲۵) ستمبر ۱۹۸۶ء، فروری ۱۹۸۷ء، نومبر ۱۹۸۷ء، فروری ۱۹۸۸ء
- (۲۵) اپریل ۱۹۸۸ء، اکتوبر ۱۹۸۸ء، فروری ۱۹۸۹ء، جنوری ۱۹۹۳ء

جولائی ۱۹۹۴ء، نومبر ۱۹۹۳ء، اکتوبر ۱۹۹۳ء، جنوری ۱۹۹۴ء،

اپریل ۱۹۹۳ء، مارچ ۱۹۹۵ء، مئی ۱۹۹۵ء، فروری ۱۹۹۵ء،

(۲۶) ہماری زبان، دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء، نومبر ۱۹۶۷ء، دسمبر ۱۹۶۷ء،

(۲۷) ہمدرد صحت، کراچی، جون ۱۹۶۹ء،

(۲۸) ہندوستانی ادب، نئی دہلی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء،

(۱۰) ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے احوال اور ان کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں

درج ذیل مطبوعات و مقالات کو دیکھنا مفید ہوگا)

پانچ مطبوعات:

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شخصیت اور ادبی خدمات، مرتبہ: ڈاکٹر ظلی اٹم، طبع اول دہلی،

۱۹۹۱ء، طبع دوم کراچی، ۱۹۹۳ء،

(۲) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات، جلد اول، مرتبہ: امراؤ طارق، طبع اول کراچی،

فروری ۱۹۹۳ء،

(۳) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات، جلد دوم، مرتبہ: امراؤ طارق، طبع اول کراچی،

فروری ۱۹۹۳ء،

(۴) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات، جلد سوم، مرتبہ: امراؤ طارق، طبع اول کراچی، نومبر ۱۹۹۳ء،

(۵) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال و آثار، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر قوسوی، طبع اول، لاہور، ۱۹۹۸ء،

پانچ غیر مطبوعہ تھیں:

(۱) ”نگار پاکستان“ کی ادبی خدمات ۱۹۶۴ء تا ۱۹۹۴ء، مقالہ نگار: محمد عزیز علوی، نگران کار:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مقالہ نگار: (اُردو)، علامہ اقبال یونین پرنٹورسٹری، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء،

(۲) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت نقاد، مقالہ نگار: محمد عزیز نور علوی، نگران کار: ڈاکٹر نجیب جمال،

مقالہ ایما سے (اُردو)، بہار، المدینہ ڈسٹری بیوٹورسٹری، ملتان، ۱۹۹۸ء،

(۳) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت محقق، مقالہ نگار: نورین فرویس، نگران کار: ڈاکٹر محمد احسان الحق،

شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج، لاہور، مقالہ برائے انکم اسے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۰ء،

(۴) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور اقبال شناس، مقالہ نگار: محمد کبیر سرور نگران کار: ڈاکٹر سید صمیم الرحمن،

شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج، لاہور، مقالہ برائے انکم اسے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۶ء،

(۵) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس، مقالہ نگار: سید طاہر، نگران کار: ڈاکٹر سید صمیم الرحمن،

شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج، لاہور، مقالہ برائے انکم اسے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۶ء،



پیکن بکس

فون: 042-7351662

گلشہستان فون: 061-6620790, 6620791

E-mail: basconbooks@pakistan@hotm.com

E-mail: bascon_books_pakistan@yahoo.com



Rs. 125